

TARIKH-E-ZABAN-E-URDU

PROF. MASOUD HUSAIN KHAN

تاریخ زبانِ اُردو

پروفیسر مسعود حسین خان

ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ)، ڈی لٹ (پیرس)

سابق پروفیسر و صدر شعبہ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی

سابق پروفیسر و صدر شعبہ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اُردو زبان کے عہد بعد ارتقا کی تاریخ اور اس
کی ابتداء سے متعلق لسانیاتی نظریوں کا جائزہ

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

ترتیب

پہلا باب ہند آریائی کا ارتقا

آریوں کا وطن اور داخلہ ہند

ہند آریائی کا عہد قدیم

ہند آریائی کا عہد وسطیٰ

ہند آریائی کا عہد جدید

دوسرا باب ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں

جدید آریائی زبانوں کی گروہ بندی

مغربی ہندی اور اُس کی بولیاں

تیسرا باب اُردو زبان کا ارتقا

شمالی ہند ۱۲۰۰ تا ۱۷۰۰ء

دکن ۱۳۰۰ تا ۱۷۰۰ء

شمالی ہند ۱۷۰۰ تا ۱۸۵۷ء

چوتھا باب اُردو کی ابتدا: لسانی نظریات

اُردو اور برج بھاشا

اُردو اور پنجابی

پانچواں باب زبان "دہلی و پیرامنش

"اُردو اور ہریانوی

اُردو اور کھڑی بولی

پہلا باب ہند آریائی کا ارتقاء

آریوں کا وطن اور داخلہ ہند

ہند یورپی خاندان کی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین لسانیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ تمام زبانیں کسی ایک قدیم زبان سے نکلی ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں ہمیں میکس مولر کا یہ قول نہیں بھولنا چاہیئے کہ زبانوں کے ہند یورپی خاندان کا وجود اس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اس کے بولنے والے بھی ایک ہی نسل سے ہوں گے۔ یہ اصل زبان کیا تھی؟ اس کے بولنے والے کہاں بستے تھے، اور وہ کس طرح یورپ و ایشیا کے وسیع براعظموں میں پھیلے؟ آریوں کے متعلق یہ ایسے سوال ہیں جن پر محققین آج تک متفق نہ ہوسکے علمی تحقیق میں اختلاف کی کس درجہ گنجائش ہے اس کا اندازہ ان مختلف نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتا ہے جو آریوں اور ان کے اصل وطن کے متعلق پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا سلسلہ ہندوستان (پنجاب و کشمیر) سے شروع ہو کر ہند و کش، تبت، کاکیشیا، وسط ایشیا، جنوبی روس، بحیرہ بالٹک کا ساحل، اسکندریہ نیویا، آسٹریا، ہنگری، شمالی جرمنی، پولینڈ اور بالآخر سائبیریا اور خطہ منجمد شمالی پر ختم ہوتا ہے۔ ان سب نظریوں کی تفصیل اور پھر ان کی تردید موضوع بحث کو صرف خبط کرے گی۔ لہذا یہاں چند مستند نظریوں کی وضاحت پر قناعت کی جاتی ہے۔

آریوں کی قدیم کتابوں میں ان کے اصل وطن اور آمد کے سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ آریا تبت سے آئے تھے۔ ہندوؤں کے مذہبی عقیدہ کی رو سے تبت کو انسان کا پہلا مسکن مانا جاتا ہے، اس لیے آریوں کو بھی اسی علاقے سے منسوب کیا گیا۔ سنسکرت کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ آریا قبائل ہندوستان ہی کی پاک سرزمین سے اٹھے اور بعد میں ایران و یورپ میں پھیل گئے۔ اس نظریہ کو پنڈت ہری اودھ نے اپنی کتاب "ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس" میں وضاحت سے بیان کیا ہے اور اپنی اس رائے کی تائید میں سوامی دیانند، شری نرائن بھون راؤ پاؤگی اور کئی یورپی عالموں کی رائیں پیش کی ہیں، لیکن ان نظریوں میں قباحت یہ ہے کہ یہ تحقیق سے زیادہ عقیدے کی پیداوار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بقول میور سنسکرت کی جتنی قدیم کتابیں ہیں ان میں آریوں کے بدیسی ہونے کی طرف کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کہیں کھول کر نہیں لکھی گئی کہ آریا اسی سرزمین سے اٹھے تھے۔ رگ وید کے اندر یہاں کے دیسی قبائل اور آریوں

کی لگاتار لڑائیوں کے بارے میں جو اشارے ملتے ہیں ان سے تو صاف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آریا قبائل شمال مغربی ہندوستان کے دروں سے لڑتے بھڑتے اور فتح کرتے ہوئے ہندوستان کے میدانوں میں داخل ہوتے ہیں۔ ان محققین کا یہ طریقہ استدلال نہایت پُرس پُرسا ہے کہ چونکہ ہندوستان قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے اس لیے ابتدائی زبان کی تلاش یہیں کرنی چاہیئے۔ ایسا کہتے وقت ان کے ذہن سے وہ لسانی رشتے یکسر محو ہو جاتے ہیں جو ہمیں ایک طرف ایران اور دوسری طرف یورپ کی موجودہ زبانوں سے وابستہ کرتے ہیں۔ اسکے علاوہ اس نظریہ کے حامیوں میں اختلاف رائے بھی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ آریا پنجاب میں دریائے سرسوتی کے کنارے بستے تھے۔ کچھ قندھار اور تبت کو آریوں کی جنم بھومی بتاتے ہیں۔ پروفیسر کیتھ کا، جس کی دبی زبان سے گریسن بھی تائید کرتا ہے، خیال ہے کہ آریا قبائل کا مرزبوم ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر تھا۔ کیتھ کی یہ رائے مان لینے سے وسطی ایشیا والے نظریے (جس کی وضاحت آگے کی جائے گی) پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گریسن کا خیال ہے کہ رگ وید کے سب سے پہلے منتر آریوں کے داخلہ ہندوستان سے قبل لکھے جا چکے تھے۔ یہ اس زبان میں لکھے گئے ہیں جو ہند ایرانی زبانوں کی ماں تھی۔

تقریباً سب جدید محققین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ آریوں کے وطن کی تلاش وسطی ایشیا کے علاقوں ہی میں کرنا پڑے گی۔ ڈاکٹر چنرچی کا خیال ہے کہ قرون اولیٰ کی ہند یورپی زبان و تمدن کا گہوارہ یوریشیا کے وہ وسیع میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف پولینڈ اور جرمنی سے ملتا ہے اور دوسری طرف یورال پہاڑوں کے جنوب میں وسط ایشیا کے الطائی اور تہین شان کے سلسلہ ہائے کوہ سے۔ پروفیسر شریدر نے تعین مقام کرتے ہوئے دریائے والگا کے دہانے کو آریوں کا اصل وطن قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخی دھندلکے میں آریا مغرب اور جنوب کی طرف پھیلنا شروع ہوئے۔ جو گروہ مغرب میں داخل ہوتا ہے وہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر تمام یورپ میں پھیل جاتا ہے اور موجودہ آرمینین "یونانی" البینین، کیلٹک، جرمن، سلوائک اور تخارین زبانوں کو جنم دیتا ہے۔ دوسرا گروہ جو جنوب مشرق کی سمت اختیار کرتا ہے بحیرہ کیسپین کے شمال سے ہوتا ہوا موجودہ بدخشاں اور کوہ کند کے علاقے میں پہنچتا ہے جہاں وہ پھر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک شاخ مشرقی ایران میں داخل ہوتی ہے اور پھر دریائے کابل کی وادی کے راستے سے ہندوستان میں۔

"کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں پروفیسر (GILES) نے جغرافیائی اور تاریخی وجوہ کی بنا پر آریوں کی نقل و حرکت کے اس نظریہ کو رد کیا ہے۔ وہ آریوں کے پھیلنے کا مرکز آسٹریا ہنگری بتاتے ہیں اور اس طرح ان کے خیال میں سب سے زیادہ فطری راستہ درہ دانیال اور ایشیائے کوچک میں سے ہوگا۔ تاریخ میں بعد کو نقل مکان کی جتنی مثالیں ملتی ہیں ان میں یہی راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ بحیرہ کیسپین کے شمال مشرق سے آریوں کا گذرنا اس لئے ناممکن قرار دیا گیا ہے کہ یہ نشیبی علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ عہد عتیق میں تہ آب تھا۔ اس وقت

بحیرہ کیسپین اتنے وسیع رقبے میں پھیلا ہوا تھا کہ اس کا سلسلہ جھیل ارال سے ملتا تھا۔ اسی طرح جنوبی روس سے کاکیشیا کی جانب بھی نقل و حرکت ناممکن تھی۔ پہاڑوں کے اس دشوار گزار سلسلہ کو یونانی قدرتی فصیل سمجھتے تھے۔ آج بھی یہ سلسلہ صرف درہ ڈانیال سے عبور کیا جاسکتا ہے۔

وسطی ایشیا" والے نظریہ کی تائید ان ریکارڈوں سے بھی ہوتی ہے جو سن ۱۹۰۶ء میں ایشیائے کوچک میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کا تعلق ۱۵۰۰ قبل مسیح سے ہے۔ ان ریکارڈوں میں بعض دیوی دیوتاؤں کے نام مثلاً (اندرا، ارونا، مٹیرا وغیرہ) ملتے ہیں۔ جنہیں مٹی کے حکمران پوجتے تھے۔ یہ نام سنسکرت کی مقدس کتابوں میں جوں کے توں پائے جاتے ہیں۔ بالخصوص اعداد تو سنسکرت اعداد سے اتنے ملتے جلتے ہیں کہ یہ امر مسلم ہو جاتا ہے کہ آریا کاکیشیا کے راستے سے ایشیائے کوچک اور مشرق کی طرف بڑھے ہوں گے۔ اس طرح اوستا کی فطری اور غیر مصنوعی زبان کے دونوں کناروں پر ہمیں خالص مصنوعی زبان کے نمونے ملتے ہیں، مشرق میں سنسکرت اور مغرب میں ایشیائے کوچک کے نئے دریافت شدہ ریکارڈوں کی زبان۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آریا ان دونوں مقاموں پر بے گانوں کی طرح رہے اور اپنی نسل اور زبان کو الگ تھلگ رکھا، جیسا کہ ان کا عام دستور تھا۔ اس کے برعکس ایران خاص میں ان کی زبان فطری طور پر بدل کر اس مصنوعی رجحان کو گنوا دیتی ہے۔

ان آریوں کو تاریخی روشنی میں سب سے پہلے ہم شمال مغربی ایران میں (۲۰۰۰ ق۔ م) دیکھتے ہیں۔ ہندوستان میں آریوں کے داخلہ کی تاریخ ۱۵۰۰ ق۔ م مقرر کی جاسکتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ ہند یورپی زبان بولنے والے آریا اپنے داخلہ ہند سے قبل عرصے تک مشرقی ایران میں قیام کرچکے تھے، جہاں ان کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ۲۰۰۰ ق۔ م تک "ہند ایرانی" منزل پر پہنچ جاتی ہے "ہند یورپی" زبان کی یہ "ہند ایرانی" شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی جاسکتی ہے جو بعد کو ایران میں پھیلیں اور جسے آریا بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں آریوں کا داخلہ کسی منظم سیاسی تحریک کی شکل میں نہیں تھا یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا اور اس میں جہاں گیری سے زیادہ جہاں پیائی کا جذبہ کارفرما تھا۔

ہندوستان میں آریوں کا سابقہ دراویدی اور آسٹریک قوموں سے پڑا۔ دراویدیوں سے ان کا مقابلہ مغربی اور شمالی مغربی ہندوستان میں ہوا۔ آسٹریک زیادہ تر مشرقی اور وسط ہند کے علاقوں میں آباد تھے۔ ان قوموں کو زیر کرنے میں انہیں کافی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس جدوجہد کی جھلک رگ وید کے بعض قصوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ موجودہ ہندی تمدن خالص آریائی تمدن نہیں کہا جاسکتا۔ فاتح اور مفتوح دونوں آخر میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی شکل یہاں بھی پیدا ہوئی۔ جس طرح بعض مورخوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہندوستان میں آریائی تمدن مذہب کی آڑ میں پھیلا لیکن آریا قوم کے افراد بہت کم تعداد میں ہندوستان کو اپنا گھر بنا سکے، اسی طرح یہ کہنا بھی تاریخی غلطی ہوگی کہ آریائی سماج دراویدی تمدن کو نگل گیا تھا۔ نئے انکشافات سے یہ بات

پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان میں نووارد آریوں کا ایک ایسے تمدن سے سابقہ پڑا تھا جو کئی لحاظ سے ان صحرانوردوں کے تمدن پر فوقیت رکھتا تھا۔ چنانچہ موجودہ ہندی تمدن کے بعض بنیادی عناصر اسی قدیم ہندوستانی تمدن کی یادگار ہیں۔ آریوں نے دراویدی مذہب کے بہت سے عناصر قبول کر لئے۔ بعض دیوی دیوتاؤں کے تصورات اور دیومالا، کچھ کھانے پینے کی چیزیں (پان سپاری) اور لباس (دھوتی اور ساری) خالص درادیدی عناصر ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، محققین نے دراویدی زبانوں کے بعض عناصر کی نشان دہی کی ہے۔ ان زبانوں کا آریائی زبان کی قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا اور آریائی زبان نے "ہند ایرانی" منزل سے گذر کر "ہند آریائی" شکل اختیار کر لی۔ شمالی ہند میں اب دراویدی زبانوں کا نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ تحقیق کا یہ حصہ بالکل تاریکی میں ہے اس کے بجز کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ قدیم پرکرتوں کی پیدائش دیس کی انہیں بولیوں کی گود میں ہوئی ہوگی۔

قدیم آریائی تہذیب کی سب سے بڑی دین "براہمی" رسم الخط ہے، جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا اور جو ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاؤں - (الاردو اور کشمیری) کا ماخذ ہے اور جسے آریوں نے شروع سے اپنی زبانوں کے لئے استعمال کیا ہے۔

ہند آریائی کا عہد قدیم

(۱۵۰۰ ق م - ۵۰۰ ق م)

آریائی زبان کا پہلا مستند نقش ہمیں رگ وید (۱۰۰۰ ق م سے قبل) کی شکل میں ملتا ہے۔ اس وقت "ہند یورپی" زبان "ہند ایرانی" منزل سے گزر کر خالص "ہند آریائی" شکل اختیار کر چکی تھی۔ چنانچہ مشرقی ایران سے لے کر پنجاب تک اس لسانی ارتقاء کے تسلسل کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ رگ وید کے مختلف حصوں کی تصنیف مختلف زبانوں اور مختلف مقاموں پر ہوئی ہے۔ کسی میں قندھار کے راجہ دیوداس کا ذکر ہے تو کسی میں سندھ کے کنارے بسنے والے راجہ سورداس کا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکے کچھ منتر قندھار میں لکھے گئے کچھ دریا ئے سندھ کے کنارے اور کچھ جمناک وادی میں۔ رگ وید کے ابتدائی حصے تو تقریباً ڈھائی ہزار برس قبل مسیح کی تصنیف ہیں۔ لیکن آخری باب آٹھویں صدی قبل مسیح میں تصنیف ہوئے۔ آریائی تہذیب کے اُس وقت دو بڑے مرکز تھے۔ مغرب میں قندھار اور مشرق میں براہمہ ورتا (پٹیالہ اور کرنال کے اضلاع) اس میں شک نہیں کہ آریا ابھی دریا ئے سندھ تک ہی پہنچ پائے تھے کہ ان کی زبان نے ادبی شکل اختیار کر لی تھی۔ لیکن رگ وید کے بیشتر منتر اسی غیر مصنوعی اور سادہ زبان میں ہیں جو اس وقت آریوں کے گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ اگر بقول میکڈانلڈ رگ وید کی زبان کو ادبی مان بھی لیا جائے اس کا مطلب یہ ہرگز نہ ہوگا کہ وہ اس زمانہ کی بولیوں کی

نشان دہی نہیں کرتی۔ ادبی زبان چالو زبان سے مختلف ضرور ہوتی ہے لیکن بالکل مختلف نہیں۔ ویدک زبان کا سلسلہ دوسرے ویدوں سے بالخصوص یجروید اور براہمنہ کے نثری پاروں تک سے ملتا ہے رگ وید کی زبان شمال مغربی ہندوستان کی آریابولی پر مبنی تھی۔ آریوں کے مختلف قبائل کی بولیوں میں خفیف اختلافات تھے لیکن رگ وید کی زبان کا معیار سب تسلیم کرتے تھے۔

مغربی ہندوستان کی اس آریابولی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں (ر) اور (ل) دونوں آوازوں کے لئے صرف (ر) کی آواز مستعمل تھی۔ یہ خصوصیت قدیم فارسی میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس میں نفسی دھ۔ بھ۔ گھ۔ قسم کی آوازوں کو "ہ" میں تبدیل کرنے کا رجحان بھی ملتا ہے۔ بعد میں چل کر یہی "ر" اور "ل" کی آوازیں مشرق اور مغربی ہندوستان کی قدیم وجدی بولیوں میں امتیاز کرنے کی مخصوص علامتیں بن جاتی ہیں۔ مثلاً مغربی ہندوستان کی پراکرت میں "ل" کی آواز نہیں ملتی۔ پالی اور سنسکرت میں مذکورہ بالا دونوں آوازیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن جوں جوں ہم مشرق (بہار اور بنگال) کی طرف جاتے ہیں، وہاں کی پراکرتوں میں صرف "ل" کی آواز ملتی ہے۔ "ر" غائب ہو جاتی ہے۔

دریائے سندھ سے آریا جوں جوں مشرق کی طرف بڑھے ان کی زبان پر صوبجاتی اور دیسی بولیوں (کول، دراویدی وغیرہ) کا بھی اثر پڑا جو وید کے مختلف بابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ اثر صرف تلفظ تک محدود نہیں بلکہ دیسی الفاظ کی آمیزش بھی ہونے لگی تھی۔ دراویدی اور کول زبانوں کے ایسے الفاظ کی ڈاکٹر چٹرجی نے ایک طویل فہرست دی ہے۔ یہاں مثلاً صرف چند درج کئے جاتے ہیں: کپی (بندر) کالا (آرٹ) کالا (وقت) کنڈا (کنڈ) نیلا (نیلا) پُشپا (پھول) پوجانا (پوجا) پھلا (پھل) ہلا (ہل) بیجا (بیج) میورا (مور) راتری (رات) روپا (روپ)۔ برہمنہ میں جاکر ایسے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ملک کے دورو دراز حصوں میں پھیلنے اور غیر آریا اقوام سے ربط و ضبط بڑھنے کی وجہ سے آریا زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی۔ صرفی و نحوی اور صوتی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں بولی جانے لگیں۔ بعض جگہ الفاظ کو اجنبی ماحول کی صوتیات سے متاثر ہو کر توڑ مروڑ دیا جاتا۔ حروف کا تلفظ بھی مختلف طریقہ سے کیا جانے لگا۔ مشرقی ہندوستان کے صوبوں میں یہ تبدیلیاں تیزی سے نمایاں ہونے لگیں۔ ۱۰۰۰ ق م تا ۶۰۰ ق م آریا شمالی ہند میں پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل چکے تھے اور ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اس عہد کی گروہ بندی حسب ذیل طریقہ پر کی جاسکتی ہے۔

(۱) اُدیچہ: شمال مغربی ہندوستان کی زبان

(۲) مدھیہ دیش: (مدھیہ دیش، انبالہ سے الہ آباد) کی زبان

(۳) پراچیہ: مشرقی ہندوستان کی زبان

یہ آریا سلطنتوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اُدیچہ (شمال مغربی ہندوستان کی زبان) کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ وہ آریوں کی قدیم معیاری زبان سے قریب تر تھی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں یہی زبان زیادہ صحیح اور کھری سمجھی جاتی تھی اور لوگ آریوں کی معیاری زبان کی سنداس علاقے سے لیتے تھے۔ پراچیہ زبان کا رواج آریوں کے ان قبائل میں تھا جو موجودہ اودھ، مشرقی یو۔ پی اور مغربی بہار کے بعض حصوں میں آباد تھے۔ یہاں کی زبان... دیسی بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لہجہ کسی حد تک کھو چکی تھی۔ مغربی ہندوستان کے آریا ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور "آسوروں" (بھوت پریت) کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی زبان کو "براہمنہ" میں، "اشدھ" کہا گیا ہے۔ اس میں (ر) کی آواز (ل) میں تبدیل ہو جاتی تھی (موجودہ بہاری: راجہ = لاجہ - کھیر = کھیل) مدھیہ دیش کی زبان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے یہاں کی زبان نہ تو اس قدر معیاری سمجھی جاتی تھی جتنی کہ شمال مغربی ہندوستان کی زبان اور نہ اس قدر پست جیسی کہ پراچیہ (یورپ) کی بولی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں آریائی تہذیب کا مرکز پنجاب سے ہٹ کر دوآبہ گنگ و جمن ہوتا گیا۔ مدھیہ دیش کی زبان کو ممتاز حیثیت دی جانے لگی۔

اسی زمانے میں زبان کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی گئی۔ صوبائی اور مقامی تعصبات سے الگ ہٹ کر صرف ایسے الفاظ کو نکالی مانا گیا جو سب جگہ رائج ہوں۔ اسی طرح زبان صوبائی ہونے کے بجائے "راشٹری" (ملکی) بن گئی۔ سب لوگ ادب میں ایک خاص قسم کی نکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے اور یہ زبان بن سنور کر سنسکرت (شُدھ) ہو گئی۔ جو درجہ آج کل ہندوستانی کو حاصل ہے یا عہدِ پراکرت میں مہاراشٹری کو حاصل ہوا وہی درجہ اس زمانہ میں سنسکرت کو حاصل تھا۔ ملک کے جن جن حصوں میں آریا پھیل گئے تھے وہاں کے مذہبی، علمی اور ادبی طبقوں میں یہ سمجھی اور بولی جاتی تھی۔ جو لوگ (بالخصوص پورب کے جہاں پرکرات سب سے پہلے سراٹھاتے ہیں) بول نہ سکتے تھے وہ بھی سمجھ ضرور لیتے تھے۔ ہندوستانی بولیوں کی کثرت میں یہ وحدت کا کام دیتی تھی۔ ہندوستان کے قدیم ناٹکوں میں جن کا تعلق پہلے سنہ عیسوی سے ہے سنسکرت بولنے والے کرداروں کا تعلق عام طور سے براہمنوں یا اعلیٰ طبقے کے لوگوں سے ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سنسکرت کا رواج خاص خاص طبقوں کا ہی عرصہ بعد تک رہا۔ اس لئے یہ عام خیال لسانیات کی رو سے بالکل غلط ہے کہ سنسکرت کبھی بھی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ وہ تو صرف براہمنوں کی گھڑی، یگوں میں بولی جانے والی زبان تھی۔ پاننی نے (۳۰۰ ق م) میں زندہ زبان کی قواعد لکھی تھی۔ قواعد داں کبھی بھی کسی نئی زبان کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ البتہ وہ کڑے اصول بنا کر اس کی ترقی کو روک سکتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ہمیں اس زمانہ کے ان ماہر لسانیات کی کوششوں میں ملتی ہے۔ جنہوں نے ایک بین الاقوامی زبان "آیس پیرینیٹو" بنانے کے لئے برسوں سر مغزنی کی اور بالآخر متفقہ طور پر اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ اس لئے تاریخ زبان میں اس قسم کے

مفروضات کا بے معنی ہونا مسلم ہے۔ البتہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ گریسن جیسے بڑے محقق نے سنسکرت کے متعلق اسی قسم کا اظہار خیال کیا ہے۔ اونچے اور ادبی طبقے میں بول چال کی زبان ہونے کا وافر ثبوت ہمیں سنسکرت کے قدیم قواعد نویس یاسکا (مصنف نروکتا) کے یہاں ملتا ہے جو اس زبان کو "بھاشا" (بولی جانے والی زبان) کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس میں اور ویدوں کی زبان میں امتیاز کرتا ہے۔ اس کے بعد پانٹنی (۳۰۰ ق م) نے بھی اس زبان کو بھاشا کہا ہے۔ وہ بھی ویدک سنسکرت کو مردہ اور ادبی سنسکرت کو زندہ زبان جانتا ہے۔ کات یا بین اور تپن جلی جو پانٹنی کے بعد آتے ہیں اس فرق کو برقرار رکھتے ہیں۔ ادبی سنسکرت - (بقول گریسن کلا سیکل سنسکرت) کی سب سے پہلی جھلک ہمیں آخری براہمنوں، اُنپشدوں اور "سوتروں" میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں دراصل لفظ سنسکرت صفت کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ "سنسکرت واکیم" ٹھیک اس زبان کو کہتے تھے جسے اردو میں شستہ زبان کہا جاتا ہے رفتہ رفتہ لفظ سنسکرت ایک خاص زبان کے سلسلے میں بولا جانے لگا۔ شستہ اور وسیع ہونے کی وجہ سے ادبی تصنیفات اسی میں ہونے لگیں۔ سنسکرت زبان کی اس وقت کی شکل کو استحکام بخشنے کی خاطر پانٹنی نے اس کے اصول بنائے ہیں لیکن پانٹنی اور دوسرے وقواعد نویسیوں کی پابندیوں کے باوجود سنسکرت زبان میں کیا باعتبار الفاظ اور کیا باعتبار صرف و نحو کافی عرصہ تک ارتقاء ہوتا رہا ہے اور بحیثیت علمی و تصنیفی زبان کے اس کارواج جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے بہت بعد تک رہا۔

رفتہ رفتہ سنسکرت کا رواج کم ہونے لگا۔ اس کے کئی سبب تھے۔ چونکہ اس نے مذہب اور ادب کو اپنے آغوش میں جگہ دی اس لئے یہ عوام کی بولیوں سے دور ہوتی گئی۔ نیز ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ہر زبان کا مقدّر یہ ہے کہ وہ تھوڑے عرصہ میں خواص کی زبان بن جائے۔ لیکن اس کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جو مہاویر سوامی (متوفی ۴۶۸ ق م) اور مہاتما گوتم بدھ (متوفی ۴۸۶ ق م) کی کوششوں سے ہندوستان میں نمودار ہوا۔ دونوں نے اپنے اپنے دھرموں کا پرچار اپنے یہاں کی مقامی بولیوں میں کیا۔ عوام نے اس کا استقبال کیا۔ اس طرح مذہب کا سہارا لے کر صوبائی بولیاں چمک اٹھیں اور سنسکرت سے ٹکڑلینے لگیں۔ ردّ عمل کے طور پر ویدک مذہب کے علمبردار اپنی زبان کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے۔ سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی۔ سنسکرت کے زوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور جامد نہیں تھی جتنی کہ ادبی سنسکرت کے زوال سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور جامد نہیں تھی جتنی کہ ادبی سنسکرت اپنی اہلیت کی وجہ سے اس نے "دیوبانی" کا رتبہ تو پایا لیکن یہی "امرپن" اس کے لئے بار بن گیا۔ ادھر اس کی دوسری بہن جورانی نہ بن کر عوام کی گود میں پلی جس نے آریوں کے علاوہ غیر آریوں کو بھی سمیٹا

مروجہ زبان کی ماں بن بیٹھی۔ استعارہ میں یہی بات یوں کہی جائے گی کہ زبان کا جو دھارا آریوں کے وقت سے بہنا شروع ہوتا ہے اس کی ایک شاخ جھیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے، حسین لیکن محدود، جسے ہم سنسکرت کہتے ہیں۔ جس کے ارد گرد اس کے گرامر کے سنگین ساحل پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دھارے کی دوسری شاخ مختلف روپ بدلتی ہوئی اب تک ہم رہی ہے کبھی گدلی، کبھی تابناک، لیکن ہر لحظہ پھیلتی ہوئی۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا تعلق براہ راست دھارے کی اسی شاخ سے ہے۔ مختصر یہ کہ آریوں کی "ابتدائی زبان" ہی سے ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت پیدا ہوئیں۔ اور غیر آریوں کے میل کا سہارا پاکر دوسری صوبائی بولیاں بھی پھوٹیں۔ سنسکرت نے صرف چنے ہوئے شائستہ اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا۔ لیکن دوسری نے ویدک زبان کے فطری رجحان کو اپنایا۔ یہی ان کے پراکرت (فطری) کہلانے کا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ویدک زبان کی بعض خصوصیتیں جو ان میں ملتی ہیں، ادبی یا کلاسیکی سنسکرت میں نہیں ملتیں۔ اس طرح ویدک سنسکرت اور پراکرتوں میں ادبی سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ قریب کا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں یہ بات واضح ہو گئی کہ شروع ہی سے عوام کی زبان ایک مخلوط زبان تھی۔ ایک ایسی زبان تھی جس میں آریوں کی ابتدائی زبان اور دیسی بولیوں دونوں کا میل تھا۔ بعض لوگوں نے اسی کو "پہلی پراکرت" کہا ہے اور ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت دونوں کی ماں مانا ہے۔ ہم اُسے "ابتدائی زبان" کے نام سے یاد کریں گے اور پہلی پراکرت صرف اس زبان کو کہیں گے جس کا ادبی روپ پالی ہے۔ ویدک سنسکرت اسی "ابتدائی زبان" کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور اس کا پرچار کافی عرصہ تک برہمنوں کے گھروں اور ان کی مذہبی کتابوں میں رہا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب یہ ترش ترشا کر برہمنوں کے ہاتھوں ادبی سنسکرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پیدائش کے بعد بھی عوام کی بولی کا ڈھرا الگ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں سنسکرت کے قدیم نمونے مل جاتے ہیں اور عوام کی ان بولیوں کے نام تک نہیں ملتے۔ پراکرت کے سبب سے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا پھراشو (۲۵۰ ق۔ م) کی لاٹوں پر کندہ کئے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی کو ہم پہلی پراکرت ماننے پر مجبور ہیں۔ پراکرت کی اسی ادبی شکل کو پالی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن پراکرت کا یہ نام اس وقت پڑا جب اس نے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس پر شورسینی پراکرت (شورسین، متھرا اور اس کے ارد گرد کا علاقہ) کا پورا پورا اثر پڑ چکا تھا۔ لفظ پالی سنسکرت کے "پنکتی" سے نکلتا ہے۔ (اسی سے اردد کو پانتی، پتی اور پیٹی ہے) پنڈت ہری اودھ کی تحقیق کے مطابق پالی بدھ دھرم شاستر کی سطر کو کہتے ہیں۔ اس کے نام سے ثابت ہے کہ بدھ مت کی ابتدائی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئی ہوں گی۔ اس پالی کو قدیم مالگدھی بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہ مالگدھی (مگدھ = جنوبی بہار) بعد کی نئی مالگدھی سے مختلف تھی۔ اس وقت یہی بول چال کی زبان تھی۔ بدھ لوگ اسی کو سب سے پہلی زبان مانتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ انسانوں کی سب سے قدیم زبان یہی ہے

اور اس سے دیگر زبانیں، سنسکرت وغیرہ نکلی ہیں۔ گوتم بُدھ نے اسی بولی میں اپنے دھرم کی تبلیغ کی تھی۔ مدھیہ دیش کے عالموں اور اُدیچہ (پنجاب وغیرہ) کے بولنے والوں کے نزدیک یہ لچر اور پوچ زبان تھی جس میں ان کی زبان کے الفاظ بگاڑ دیئے جاتے تھے۔ گوتم بُدھ اس زبان کی اہمیت پر کس قدر زور دیتے تھے، اس پر روشنی اس واقعہ سے پڑتی ہے جو ان سے منسوب ہے۔ یمیل اور اُتے کیل ناموں کے دو برہمن بھائی مہاتما کے پاس آتے ہیں اور درخواست کرتے ہیں کہ اے بھگوان! مختلف ذات پات کے لوگ آپ کے بولوں کو دُہرا کرنا پاک کر رہے ہیں اس لئے ہمیں حکم دیجئے انہیں چھندوں (ویدک سنسکرت) میں لکھ دیں تاکہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جاسکے۔ مہاتما انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ "اے بھکشو! بُدھ کے بولوں کو سنسکرت میں ہرگز نہ لکھنا، جو ایسا کرے گا۔ میری توہین کرے گا۔ میری باتوں کو اپنی ہی بھاشا میں سمجھنے کی کوشش کرو" "اپنی بھاشا" سے مراد یہی مالگدھی زبان ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے پہلی پراکرت یا پالی کے نمونے یا تو بُدھوں کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں یا پھراشوک کی لاٹوں پر جو جنوب میں گنجم سے لے کر شمال مغربی سرحدی صوبے کے علاقے میں شہباز گڑھی تک ملتے ہیں۔ یہ تحریریں تو کھرو شڑی میں ہیں اور باقی سب براہمی میں۔ ان کی موشگافی کے بعد محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اشوک کے زمانہ میں زیادہ سے زیادہ چار اور کم سے کم دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک مشرقی دوسری مغربی۔ مغربی زبان پر جیسا کہ شہباز گڑھی کی لاٹ سے ثابت ہے۔ سنسکرت کا اثر گہرا تھا وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مشرقی زبانوں کی بہ نسبت قدیم آریائی زبان سے زیادہ قریب تھی، گریسن نے بھی زبان کے اس اختلاف کو مشرقی مغربی پراکرت کے نام سے یاد کیا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی لسانی خصوصیات ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ مغربی پراکرت کی نمایاں شکل شورسینی پراکرت تھی۔ مشرقی پراکرت مالگدھی کہلاتی تھی۔ یہ مگدھ دیس (جنوبی بہار) میں بولی جاتی تھی۔ اس زمانہ تک کسی ایسی پراکرت کا پتہ نہیں ملتا۔ جسے دکھنی پراکرت کہا جاسکے۔

ہند آریائی کا عہدِ وسطی

(۵۰۰ ق۔ م تا ۶۰۰ ق۔ م)

اس عہد میں بھی ہند آریائی زبان کے ارتقا کی دو نمایاں شکلیں نظر آتی ہیں ایک طرف تو عوام کی بولیاں بُدھ اور جین متوں کا سہارا لے کر تیزی کے ساتھ ادبی پراکرتوں کی شکلیں اختیار کر رہی تھیں۔ دوسری طرف سنسکرت جو باعتبار صوتیات اور صورتات ابھی تک آریائی زبانوں سے رشتہ جوڑے ہوئے تھی اور جس کی

نحو اور فرہنگ سے روح عصر بھی جھلکتی تھی، علمی اور ادبی طبقوں میں دھاک جمارپی تھی۔ بُدھ اور جین متوں کے پیغمبر بھی سرزمین ہند سے اس کی جڑیں نہ اکھاڑ سکے۔ بلکہ جوں جوں پراکرتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور زبان کا دھارا اپنے سرچشمہ سے دور ہوتا گیا، سنسکرت کی اہمیت کا لوگوں کا اور زیادہ اندازہ ہوتا گیا۔ اگر ایک طرف یہ عہد وسطیٰ کی لسانی خصوصیات کی آئینہ بردار تھی تو دوسری طرف قدامت پرستی کے جذبہ کو بھی تسکین دیتی تھی۔

ویدک سنسکرت کے بہت سے لفظ اب متروک ہو گئے تھے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے پانٹنی کے سخت قید و بند کے باوجود سنسکرت کا ارتقاء نہ رُک سکا۔ قطع نظر فرہنگ کے نحوی قاعدوں میں بھی خفیف تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

سنسکرت کے پہلو بہ پہلو پراکرتوں کا بھی ارتقا ہوتا رہا۔ موجودہ تحقیقات کی بنا پر پہلی اور دوسری پراکرت میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ دوسری پراکرت کے ابتدائی حالات کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ پالی ہی کے اندر ہمیں اس پراکرت کی شکل دکھائی دیتی ہے پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ تلفظ کا بگاڑ اور الفاظ کا توڑ مروڑ سب سے پہلے ہندوستان کی مشرقی بولیوں میں نمودار ہوتا ہے۔ ان بولیوں میں حروف صحیح (مصمتوں) کامیلان جذب پذیری کی طرف پایا جاتا تھا اور دندانی آوازیں (مثلاً "ر" کا "ل" میں بدل جانا) مخی آوازوں میں بدل جاتی تھیں۔ یہ خصوصیت آج بھی بنگال اور بہار کی بولیوں میں پائی جاتی ہے۔ مشرقی ہندوستان میں ۶۰۰ء ق۔ م کے لگ بھگ دوسری پراکرت کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ مغربی یو۔ پی (دو آب) اور پنجاب میں یہ لسانی تبدیلیاں آہستہ آہستہ بعد کو رونما ہوتی ہیں۔ آج بھی ان علاقوں کی بولیوں میں انفی آوازوں اور مشدد لفظوں کی کثرت ملتی ہے جو عہد وسطیٰ کی پراکرت کی نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ اس کے برعکس مشرق کی بولیوں میں حروف علت (مصوتوں) کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔

عہد وسطیٰ کی پراکرتوں میں جذب پذیری اور دندانی آوازوں کو مخی آوازوں میں تبدیل کردینے کا مذکورہ بالا رجحان ضروری نہیں کہ دراویدی اور آسٹریک زبانوں کے اثرات کا نتیجہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ یہ نسل اور زبان کے ارتقا کا فطری عمل ہو۔ چوں کہ ابھی تک دراویدی اور آسٹریک کے متعلق پورا علم نہیں ہے اس لئے تحقیق کا یہ پہلو تا حال تاریکی میں ہے۔

اس عہد کی ادبی پراکرت کی پانچ واضح شکلیں نظر آتی ہیں :

(۱) مہاراشٹری : ادبی حیثیت سے اس زمانہ میں مہاراشٹری پراکرت کو سب سے زیادہ عروج حاصل تھا۔ عہد پراکرت کے قواعد نویسوں نے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے بلکہ اسے نمونہ مانا ہے۔ دوسری پراکرتوں کا سرسری طور پر ذکر کردینے کے بعد ہمیشہ یہ لکھ دیا ہے کہ باقی سب باتوں میں یہ مہاراشٹری سے ملتی جلتی ہیں۔

اس عہد کا بیشتر شعری ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ موسیقی میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ حروف علت (مصوتوں) کی کثرت کی وجہ سے اس میں لوچ زیادہ تھا۔ آج بھی مہاراشٹر کا سنگیت اُتم مانا جاتا ہے اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لفظ مہاراشٹر سے اکثر ملک ہندوستان مراد لی جانے لگی۔

ڈاکٹر چٹرجی نے ڈاکٹر من موہن گھوش کی ایک تصنیف کے حوالے سے مہاراشٹری پراکرت کی علیحدہ حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں مہاراشٹری کی نسبت ملک مہاراشٹر سے نہیں بلکہ وہ شوریسینی پراکرت کی ایک شستہ اور ترقی یافتہ شکل تھی (مفصل بحث کے لئے دیکھئے چٹرجی کی انڈوایرین اور ہندی صفحہ ۸۴)۔

(۲) **شوریسینی** : اس کا مرکز شوریسین دیس (دوآبہ کا وسطی حصہ : متھرا) تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقہ میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو وہ یہی تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سنسکرت کے نائکوں میں بھی اس کی چھٹ پٹی جھلک ملتی ہے۔ دراصل متھرا (دوآبہ گنگ و جمن) ہی وہ علاقہ ہے جہاں سنسکرت اور شوریسینی پراکرت دونوں پروان چڑھتی ہیں۔ اس لیے دونوں میں نہایت قریب کا رشتہ نظر آتا ہے۔ سن سہاء سے پہلے ہی اس نے مسلم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

(۳) **ماگدھی** : مگدھ دیس (جنوبی بہار) کی پراکرت تھی۔ چونکہ یہ آریائی تمدن کے مراکز سے کافی دور جا پڑی تھی اس لئے ایک غیر مہذب اور ناشستہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ ماگدھی پراکرت اس وقت آریائی زبان کے پھیلاؤ کی مشرق میں آخری حد تھی۔ بعض مصنفوں نے اس پراکرت کو پالی سے خلط ملط کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ پالی کا یہ نام (ماگدھی) سب سے پہلے سیلون کے بدھوں میں پڑا، جو ہندوستانی زبانوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے۔

(۴) **شوریسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیان علاقے (بہار سے الہ آباد تک) میں اُردھ (آدھی) ماگدھی** پراکرت بولی جاتی تھی۔ بعد کو جس علاقے کو دلی والے "پورب" کے نام سے پکارتے رہے ہیں، مغربی ہندوستان کے رہنے والے اس وقت پراچیہ کہا کرتے تھے، پراچیہ کے تحت ماگدھی اور اُردھ ماگدھی دونوں آجاتی تھیں۔ ان دونوں میں اُردھ ماگدھی کو فروغ رہا گوتم بدھ اور مہابیر جین دونوں نے اسی کی قدیم شکل میں اپنے اپنے دھرم کا پرچار کیا۔ اس کا رواج اس زمانہ کے شاہی خاندانوں تک میں رہا۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر اثر انداز بھی ہوئی۔ تاریخ سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ دوآبہ کے رہنے والوں کو اس وقت مشرق کی اس پراکرت کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی یہ اس وقت کی معیاری زبان تھی، گرنار، شہباز گڑھی اور مان سیہرا کی لائوں تک میں اس کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں لیکن خود اُردھ ماگدھی پراکرت مارکنڈے کی مطابق شوریسینی اور ماگدھی کے میل سے بنی ہے۔ آج کل مشرقی ہندی (پوربی) کی بناوٹ پر غور کرنے سے بھی یہی

معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف یہ موجودہ بہاری اور دوسری طرف مغربی ہندی (دو آبہ کی زبان) کی آمیزش سے بنی ہوگی۔

پشاپی پراکرت، وہ پراکرت جو پنجاب اور کشمیر کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ (پشاپی = کچا گوشت کھانے والے) اتنے دھندلکے میں تھی کہ عوام میں یہ بھوت پریت کی زبان کے نام سے مشہور تھی۔ عہد پراکرت کے قدیم قواعد نویس وروچی (تقریباً ۱۰۰ ق۔ م) نے جو چار پراکرتیں گنائی ہیں۔ اس میں پشاپی کو بھی جگہ دی ہے اس کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) مہاراشٹری (۲) پشاپی (۳) ماگدھی (۴) شورشینی۔ ہیم چندر نے بھی جس کا زمانہ بارہویں صدی کے اواخر کا ہے پشاپی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ادب بھی ملتا ہے۔ راج شیکھر (دسویں صدی کے آغاز) نے اپنی "کاویہ می مانسا" میں ایک پرانا اشلوک نقل کیا ہے جس سے اس زمانہ کی بولیوں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اس کے خیال میں جو شاعر مدھیہ دیش میں رہتا ہے وہ لاٹ (گجرات) ٹک (ٹانک، جنوبی پنجاب) بہادانک (راجپوتانہ کا کوئی حصہ) ان سب علاقوں کی زبانوں پر قدرت رکھتا ہے۔ گریسن نے بھی رام شرما کی تحریروں کے اس حصے پر کافی زور دیا ہے۔ جس میں پشاپی کا ذکر ہے۔ رام شرما سے اتفاق کرتے ہوئے گریسن پشاپی زبان کی دو شکلیں قرار دیتا ہے ایک خالص اور دوسری مخلوط پہلی سات اور دوسری کی چار شکلیں مانی گئی ہیں۔ کشنوں کے عہد (پہلے سے چار سے تک) میں شمالی مغربی ہندوستان کی اس پراکرت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں شاہی سرپرستی کے تحت "گندھار" کی بولی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے اس علاقہ میں رائج ہو گئی اور ٹکسلا کا ددارالعلوم اس وقت علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا، جہاں تحصیل علم کی خاطر ہندوستان کے دور دراز علاقوں سے طالب علم آتے تھے۔

موجودہ پشاپی زبانیں خالص ہندوستانی نہیں کہی جاسکتیں ان کے تلفظ کے اصول (مثلاً لہندا میں "ر" کا تلفظ) ہند آریائی زبانوں کے اصولوں سے مختلف ہیں۔ ان میں کہیں کہیں ایرانی زبانوں کی خصوصیات بھی جھلک آتی ہیں وہ نہ تو خالص ہندوستانی معلوم ہوتی ہیں اور نہ خالص ایرانی۔ ژنداوستا۔ کی زبان سے شاید بہت پہلے ان کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے منقطع ہو گیا تھا۔ بھنڈا رکر کے خیال کے مطابق یہ پشاپی پراکرت شاید آریا قوم کی اس شاخ سے تعلق رکھتی ہے جو ہم قوموں کے ساتھ عرصہ تک رہی لیکن ہندوستان میں ان کے بعد داخل ہوئی، یا یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری آریائی قوموں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی ہو لیکن علیحدہ ایک طرف پہاڑی علاقے میں بس گئی ہو دونوں صورتوں میں پشاپی پراکرت آریائی زبان ہونے کے باوجود ہندوستان کی آریائی زبانوں سے کافی حد تک مختلف ہو جاتی ہے۔

یہ باب ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

ہر پراکرت کا نام اس دیس کے کسی نہ کسی علاقہ سے منسوب کیا گیا ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ پراکرت اس علاقہ کی بولیوں کی نمائندگی کرتی ہے یہ درحقیقت ایک بڑا لسانی مغالطہ تھا جسے جدید تحقیق نے رد کر دیا ہے۔ مثلاً پالی جسے ماگدھی بھاشا کے نام سے بھی پکارا گیا ہے مگدھ دیس (جنوبی بہار) سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ یہ بہار کی قدیم بولی کی بہ نسبت مدھیہ دیش کی قدیم بولی سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہے جس کے تانے بانے شوریسینی پراکرت سے گتھے نظر آتے ہیں۔ یہی حال مہاراشٹری پراکرت کا تھا جو بقول چٹرجی شوریسینی پراکرت کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

ہند آریائی کا عہد جدید

(سن ۶۰۰ء تا سن ۱۰۰۰ء)

لسانیات کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چنانچہ جب پراکرتوں نے دی شکل اختیار کرنا شروع کی تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔ اسی بول چال کی زبانوں کو اس عہد کے قواعد نویسوں نے "آپ بھرنش" (بگڑی زبان) کہا ہے۔ تاریخ لسانیات کی یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ لوگ ہمیشہ زبان کے سنورنے کو اس کے بگڑنے سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں۔ بہامہ اور دنڈی (ساتویں صدی عیسوی) کے تذکروں اور ولہی کے راجہ دھرسین کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی میں آپ بھرنش تحریر میں استعمال ہونے لگی تھی۔ کالی داس کی "وکر مورشی" میں اسکے اشعار ملتے ہیں۔ بلکہ بعضوں کے نزدیک تو دوسری یا تیسری عیسویں سے ہی اس کی جھلکیاں پراکرت کے ادب میں ملتی ہیں۔ مثلاً اس زمانہ کی شمال مغربی پراکرت کا عام رجحان یہ ہے کہ (و) (او) میں تبدیل ہو جاتا ہے لیکن آپ بھرنش کو اتنا قدیم نہیں مانا جاسکتا۔ کیوں کہ پراکرتوں کے نمونوں میں آپ بھرنش کی عام خصوصیات مثلاً سنسکرت اور (م) (:) کے بجائے (ا) یا (م) کے بجائے (واں) وغیرہ نہیں ملتیں۔ غرض کہ اس کے بیج ممکن ہے، دوسری صدی عیسوی کی پراکرت تک مل جائیں، لیکن یہ پروان چھٹی صدی عیسوی میں جاکر چڑھتی ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما بھی اس سے متفق ہیں۔ "آپ بھرنش (لفظی معنی "افتاد") پراکرت کا مابعد کا ارتقا ہیں۔ ان بولیوں کا آغاز چھٹی صدی عیسوی سے ہوا" ہندوتان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کی تاریخ ۱۰۰۰ء مقرر کی گئی ہے۔ لیکن آپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی صدی سے لے کر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی عیسوی تک ملتا ہے "پراکرت پنگل" (پندرھویں چدی عیسوی) کی تصنیف اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ بھرنش (بلکہ پراکرت) کی قدیم روایات کے جکر بند سے عرصہ تک ہمارے شعرو

ادب کو چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ اس زمانہ میں علمیت کا سارا دار و مدار اس بات پر تھا کہ ان روایات کو کس حد تک نبھایا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی فتوحات نے اس وقت ہر چیز کو تہ و بالا نہ کر دیا ہوتا تو شمالی ہند میں نئی آریائی زبانوں کا ظہور عرصہ تک کے لیے ملتوی ہو جاتا۔

شروع شروع میں لفظ "آپ بھرنش" کسی خاص زبان کے لئے استعمال نہ ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ ان پڑھوں کی زبان کو آپ بھرنش "یا" آپ بھاشا "کہا کرتے تھے۔ تین جلی نے اپنی "مہا بھاش" میں اس لفظ کا ذکر ان معنوں میں کیا ہے۔ اس کے خیال میں اس زبان میں بگڑے ہوئے الفاظ کی تعداد خالص سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ سنسکرت کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی آپ بھرنش ملتے ہیں۔ یہاں آپ بھرنش سے مراد تین جلی وہ الفاظ لیتا ہے جو سنسکرت کے کسی ایک لفظ کے معنوں میں مختلف مقامات پر بولے جاتے تھے۔ آریا لوگ اپنی زبان کے معاملہ میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ سنسکرت میں "ملچہ" آپ بھرنش لفظ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے گھن اور نفرت کا مفہوم بعد کو پیدا ہوا۔ ایک خاص زبان کے معنوں میں سب سے پہلے ہم چندر نے لفظ آپ بھرنش استعمال کیا ہے۔

آپ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پاکر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اسکی طرف متوجہ ہوا۔ پورب کی زبانوں تک نے اس کے اثر کو قبول کیا۔ لیکن گجرات، راجپوتانہ اور دو آبہ میں بولی جانے والی بولیوں پر اس کی چھاپ گہری پڑی۔ چنانچہ ۸۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک دو آبہ کی شورسینی آپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا سبب راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا۔ جن کی راجدھانی اس وقت گنگا کی ترائی میں شہر قنوج تھا۔ اس کے علاوہ گجرات کے جینیوں نے بھی اس کو ترقی دی۔ پراکرت کے بڑے عالم مارکنڈے نے آپ بھرنش کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

(۱) ناگر آپ بھرنش: جو گجراتی اور راجستھانی کی قدیم بولیوں کی ادبی شکل تھی لیکن جس پر شورسینی کا اس قدر اثر پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ اس آپ بھرنش کو فوقیت اس لئے حاصل تھی کہ یہ علمی طبقہ میں مقبول تھی ناگری اسی کی رعایت سے پڑا ہے خود اس کا "ناگر" نام گجرات کے ناگر برہمنوں کے نام پر پڑا۔

(۲) براچڈ آپ بھرنش:۔ یہ سندھ میں رائج تھی موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے۔

(۳) آپ ناگر:۔ یہ ناگر براچڈ کے میل سے بنی تھی اور اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب

میں تھا۔

(۴) پورب میں اشوک کے بعد وہاں کی زبان نے بالکل ترقی نہیں کی۔ کم از کم ماگدھی پر تاریخی سایہ آبی جاتا ہے یہ ایک نیچ زبان سمجھی جانے لگی تھی، سنسکرت کے ناٹکوں میں نیچ ذات کے کرداروں سے یہی بلوائی جاتی تھی۔ آردھ ماگدھی اور ماگدھی دونوں کے علاقوں میں شورسینی ہی ادبی زبان کی حیثیت سے رائج

تھی۔ اس زمانہ میں پورب کے شاعر اسی میں شاعری کرتے تھے اور یہ سلسلہ عرصہ تک قائم رہا۔ دسویں سے تیرھویں صدی تک کی پرانی بنگلہ شاعری میں شورسینی کا اثر صاف جھلکتا ہے، میتھلا (بہار) کے مشہور شاعر ودیپتی (تیرھویں صدی عیسوی) نے میتھلی کے ساتھ ساتھ "اوہٹ" میں بھی شاعری کی ہے۔ اسی طرح شورسینی آپ بھرنش اس وقت شمالی ہند کی "لنگوافرنیکا" کی حیثیت رکھتی تھی، جو گجرات و مغربی پنجاب سے لے کر بنگال تک رائج تھی۔ اس کے ادب کی نشاندہی ۸۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک کی جاسکتی ہے جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، گجرات اور راجپوتانہ کے جینیوں نے اس میں ادب کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ بنگال میں بدھ مت کے مبلغوں.... (سڈھوں) نے مذہبی امور کے لئے اسی کو اپنایا۔ پنجاب میں "گورکھ پنڈتوں" نے اپنے پراسرار مذہب کی تبلیغ کے لئے اسی کو آئہ کار بنایا۔ مذہب اور ادبیات سے قطع نظر دو آہ اور اس کے آس پاس کے علاقے میں یہ گھریلو زبان کی حیثیت سے رائج تھی جس میں عوام کی مذہبی اور عشقیہ واردات کے زبردست نقش ملتے ہیں۔ ڈاکٹر کیڈکا یہ خیال صحیح نہیں کہ آپ بھرنش آہیر (موجودہ اہیر) اور گوجر قبائل کی زبان تھی۔ جیسا کہ پرانی بنگلہ شاعری اور ودیپتی کی تصنیفات سے صاف ظاہر ہے۔

رفتہ رفتہ یہ آپ بھرنش بھی ادبی بن کر رہ گئی۔ اپنے آخری دور (۱۰۰۰ء) میں یہ بہت کچھ موجودہ زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے۔ موجودہ ہندوستانی زبان اور شورسینی آپ بھرنش کی درمیانی منزل کو بعض اوقات "اوہٹ" بھی کہا گیا، ودیپتی کی شاعری اسی میں ہے۔ اس میں عام طور سے مروجہ بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اسی "اوہٹ" میں جب پراکرتی روایات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے تو اسے پنگل کہتے ہیں۔ راجپوتانہ کے بھاٹ شاعر اپنی ڈنگل (قدیم راجستھانی) کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شاعری کرتے تھے۔ یہ صحیح صحیح بتانا ذرا مشکل ہے کہ آپ بھرنش کس ۸۰۰ء میں ختم ہوتی ہے اور موجودہ آریائی زبانوں کا کب آغاز ہوتا ہے۔ لسانی تبدیلیاں نہایت چپکے اور چھپ کے رونما ہوتی ہیں۔ اندازاً کہا جاسکتا ہے کہ جدید آریا زبانوں کا طلوع ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے۔ یہ بہت بڑے سیاسی الٹ پھیر کا زمانہ تھا۔ مسلمان آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے جلو میں ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان آرہی تھی۔ انہوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبانوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا۔ ہندوؤں ازمندہ وسطی کی مذہبی تحریکوں سے ان کو تقویت پہونچی۔ چنانچہ بہت جلد ان زبانوں میں مذہبی گیتوں اور کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

اس عہد میں سنسکرت کا دخل فصل بھی کم ہو گیا تھا۔ لیکن مذہبی حلقوں میں اب بھی اس کا رواج تھا۔ البیرونی (۱۰۲۵ء) نے اپنے ہندوستان کے دوران قیام میں اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ عوام کی زبان اور اس کا شعر و ادب سنسکرت کی سخت بندشوں سے آزاد ہو کر آگے بڑھ رہا ہے۔ لیکن اے عوام کی ان بولیوں سے نہ تو دلچسپی تھی اور نہ واقفیت۔ قدیم علوم کی تحصیل کی وجہ سے اس کا تعلق زیادہ تر سنسکرت جاننے والے پنڈتوں

سے رہا۔ اسی وجہ سے اس نے سنسکرت کی اہمیت پر غیر معمولی زور دیا ہے۔
غرض کہ ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ آپ بھرنشوں سے ہوتی ہے ان کا
سلسلہ حسب ذیل آپ بھرنشوں سے ملایا جاسکتا ہے۔

(۱) شُورسینی آپ بھرنش

(۱) کھڑی بولی یا ہندوستانی (موجودہ اُردو، ہندی)

(۲) راجستھانی

(۳) پنجابی (مشرقی)

(۴) گجراتی اور پہاڑی بولیاں۔

گجراتی اور راجستھانی کا تعلق شُورسینی کی اس شکل سے ہے جسے ناگراپ بھرنش بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) ماگدھی آپ بھرنش

اس علاقہ بہت وسیع تھا اس لئے مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام پڑ گئے۔ بنگال میں پراچیہ، گور
اور ڈھکئی کہلائی جس سے موجودہ بنگالی اور آسامی نکلیں۔ اڑیسہ میں اس کا نام "آت کلی" پڑا جس سے
موجودہ زبان اڑیا نے جنم لیا۔

بہار کی تمام بولیاں اس کے تحت آجاتی ہیں۔ بہار کی بولی کا نام "مگھی" ہے جو ماگدھی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

(۳) اُردھ ماگدھی آپ بھرنش

پوری ہندی (اودھی وغیرہ)

(۴) مہاراشٹری آپ بھرنش

اس کا خاص مرکز موجودہ برار تھا۔ سنسکرت میں اسی صوبہ کو مہاراشٹر کے نام سے پکارا گیا ہے۔
۵ شمالی مغربی ہندوستان کی پراکرتیں اور آپ بھرنش ابھی تک تاریخی دھندلکے میں ہیں۔ ان نقشہ کا حسب ذیل
ہوسکتا ہے۔

(الف) برا چڈ آپ بھرنش۔ سندھی۔

(ب) کیکی آپ بھرنش :- لہندا دیس کا قدیم نام کیکی تھا یہ برا چڈ سے ملتی جلتی آپ بھرنش ہوگی۔ اسی

لیے سندھی اور لہندا (مغربی پنجاب) میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

مشرقی پنجابی کا تعلق بھی اسی کیکٹی آپ بھرنش سے تھا۔ لیکن بعد کو اس پر شورسینی کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح گریسن نے اس کا سلسلہ بھی شورسینی آپ بھرنش سے ملادیا۔ جدید پنجابی زبان کی ساخت اور پرداخت میں شورسینی آپ بھرنش اور لہندا کی قدیم زبان کا کیا حصہ ہے اس ذکر تفصیل سے آگے آئے گا۔

آپ بھرنش کا باب ختم کرنے سے پہلے اس طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ جدید زبانوں کے رشتے ناتے قدیم پراکرتوں اور آپ بھرنشوں سے اتنی آسانی سے نہیں ملائے جاسکتے جتنا کہ بعض محققین نے سمجھ رکھا ہے۔ مثلاً بہاری، بنگالی، اڑیا اور آسامی زبانوں کا سلسلہ ماگدھی آپ بھرنش سے ملایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب اگر صرف اس قدر ہے کہ ان تمام زبانوں میں ماگدھی آپ بھرنش کے بعض اصول مشترک ہیں تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اس سیمرا دیہ لی جائے کہ ۶۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک بہار، بنگال، آسام، اور اڑیسہ میں صرف ایک ہی زبان بولی جاتی تھی جس کی ادبی شکل ماگدھی آپ بھرنش ہے تو یہ نہ صرف غلط بلکہ لسانی اعتبار سے ناممکن ہوگا۔ اتنے بڑے علاقے میں اگر ایک زبان بولنے والے پھیل جائیں تب بھی علاقائی اختلافات پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ یہی استدلال شورسینی اور اس سے متعلق زبانوں کے سلسلے میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ شورسینی پراکرت یا آپ بھرنش سے موجودہ پنجابی، راجستھانی اور مغربی ہندی کی بولیاں نکلی ہوں، یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شورسینی آپ بھرنش، شورسین دیس (مٹھرا) کی قدیم بولی کی بنیاد بنی ہوئی ادبی زبان رہی ہوگی، اسی کے ساتھ ساتھ آس پاس کے علاقوں میں اس وقت جدید زبانوں کی قدیم شکلیں رائج ہوں گی جن کے نمونے آج نہیں ملتے۔ آج بھی کچھ ایسی ہی حالت نظر آتی ہے۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک ادبی حیثیت سے صرف ایک زبان استعمال میں لائی جاتی ہے۔ اس زبان کی بنیاد اس بولی پر ہے جو دلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی ہے۔ یعنی کھڑی بولی۔ اس کے ساتھ ساتھ برج بھاشا، اودھی، بندیلی، بگھیلی، پنجابی اور بہاری بولیاں آج بھی اپنے اپنے علاقوں کی زندہ زبانیں ہیں۔ لیکن چوں کہ ان میں سے کسی کو بھی ادبی مرتبہ حاصل نہیں اس لئے آج سے دو سو سال بعد کے محقق کو ان زبانوں کے علاقوں میں بھی صرف ادبی زبان (اُردو یا ہندی) کے نمونے مل سکیں گے۔ کیا اس وقت یہ طریق استدلال صحیح ہوگا کہ چونکہ کھڑی بولی اتنے وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اس وقت یہ طریق استدلال صحیح ہوگا کہ چونکہ کھڑی بولی اتنے وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی اس لئے اس علاقے کی تمام بولیاں ضرور ہے کہ اسی سے نکلی ہوں گی۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ادبی کھڑی بولی کو آج جتنا عروج حاصل ہے ہندوستان کی کسی زبان کو کسی زمانہ میں حاصل نہ تھا۔ اس کے باوجود کھڑی بولی ابھی تک (قطع نظر شہر اور قصبات کے) مقامی بولیوں کی جگہ نہیں لے سکی ہے، دراصل زبان کا جو نقشہ آج ہے وہی آج سے آٹھ سو برس پہلے تھا اور وہی آج سے اٹھارہ سو برس پہلے۔ (پراکرتوں کا طلوع) بھی تھا۔ یعنی صوبائی اور مقامی بولیوں کی

کثرت کے درمیان ایک ادبی زبان کی وحدت ! یہ لسانی نقشہ سیاسی الٹ پھیر کے ساتھ بدلتا رہا۔ آریوں کے داخلہ ہندوستان (۱۵۰۰ ق م) سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہندوستان (۱۰۰۰) تک کی تاریخ مختلف سلطنتوں کے بننے اور بگڑنے کی ایک طویل داستان ہے۔ جس علاقے کے لوگ حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے اس علاقے کی بولی آناً فاناً شاہی سرپرستی میں ہندوستان کی معیاری زبان کی حیثیت سے پھیل جاتی تھی۔ اشوک کا عہد اُردھ ماگدھی پراکرت کے عروج کا زمانہ تھا جس نے مغربی ہندوستان کی تمام پراکرتوں کو متاثر کیا۔ ہرش وردھن اور راجپوتوں کی فتوحات کے ذریعہ دو آبہ کی زبان سرائی جاتی ہے اور پہلے شور سینی اپ بھرنش اور بعد کو برج بھاشا کی شکل میں سارے شمالی ہندوستان کی مانی ہوئی ادبی زبان بن جاتی ہے۔ آج بھی اسی دو آبہ کی ایک بولی یعنی کھڑی بولی، ہندوستان کی لنگوا فرنیکا بنی ہوئی ہے جو یقیناً اس تاریخی حادثہ کا طفیل ہے کہ مسلمانوں نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔



دوسرا باب ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں

جدید آریائی زبانوں کی گروہ بندی

سہ ۱۸۸۰ میں سب سے پہلے مستشرق ہرنلے نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی ساخت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ہندوستان میں آریا دو مختلف گروہوں میں داخل ہوئے ہونگے۔ آریوں کا دوسرا گروہ پہلے گروہ کے کافی عرصہ بعد آیا ہوگا۔ لیکن وہ ان سے ملتی جلتی آریائی زبانیں بولتا ہوگا۔ گریسن ہرنلے کے اس نظریہ کو جوں کا توں تسلیم نہیں کرتا۔ تاریخی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے وہ صرف ان گروہوں کے اختلاف زبان پر زور دینا کافی سمجھتا ہے لیکن ہرنلے کے خیال میں آریوں کا دوسرا دل پنجاب کے میدانوں کو پار کرتا ہوا گنگا کی وادی تک جا پہنچتا ہے اور پہلے آریا دل کو مشرق اور مغرب (پیچھے کس طرح؟) کی طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ گریسن اس تاریخی مفروضہ سے اختلاف کرتے ہوئے دوسرے پہلو کے امکانات کو لسانی دلیلوں سے اجاگر کرتا ہے۔ اس کے خیال میں نووارد آریا اپنا راستہ بند دیکھ کر بہت ممکن ہے پہلے آئے ہوئے آریوں کے چاروں طرف نیم دائرہ کی شکل میں پھیل گئے ہوں۔ پنجاب میں ان کا مقابلہ پرانے آریوں سے ہوا ہوگا۔ جہاں سے شکست کھا کر انہیں اپنا رخ سندھ کی وادی اور وہاں سے وسطی ہندوستان مہاراشٹر، بہار اور اڑیسہ کی طرف کرنا پڑا ہوگا۔ اس طرح نئے آریا پرانوں کے ارد گرد گھیرا سا ڈال دیتے ہیں۔ ہرنلے اور گریسن دونوں کے بیانات سے یکساں نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں آریوں کا ایک گروہ اندرونی بن جاتا ہے اور دوسرا ان کے تین طرف نیم دائرہ کی شکل میں بیرونی۔ اگر ہرنلے صحیح ہے تو نووارد آریا اندرونی۔ کہلائیں گے اور اگر گریسن کی بات تسلیم کی جائے تو پرانے آریا۔

ہرنلے کے اس نظریے یا گریسن کی اندرونی و بیرونی تقسیم کا دھندلا سا روایتی ثبوت ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں مل جاتا ہے۔ بالخصوص مہابھارت کے اندر پنچالوں اور کوروں کی لڑائی درحقیقت دو آبہ کے آریا اور نووارد آریوں کے درمیان سیاسی اقتدار کے لئے زور آزمائی تھی۔ پنچالوں کے حمائی پانڈے تھے جو ایک کوہستانی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے، پنچال، کوروں کی بہ نسبت یہاں کے زیادہ پرانے باسی تھے، اس لئے ان کے رنگ سیاہی مائل بتائے گئے ہیں۔ مہابھارت میں ان آریوں کو جو دریا ئے سندھ کے کنارے پر بستے تھے "ملچھ" کے نام سے

یاد کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ دو آب والے انہیں غیر آریا سمجھتے تھے۔
 اس کے بعد "مدھیہ پردیش" (مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب) کے آریوں کا عروج ہوتا ہے وہ اپنے علاقہ سے نکل کر برابر مختلف سمتوں میں پھیلنے لگے چنانچہ سنسکرتی عہد کے جغرافیہ میں جس علاقہ کا نام بار بار آیا ہے اور جسے خالص آریوں کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ وہ یہی "مدھیہ دیش" ہے اس کی حد بندی شمال میں ہمالیہ، جنوب میں وندھیا چل اور مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک مقرر کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات کے مطابق اس کے مشرق سے سے مغربی سرے تک سرسوتی نام کا مقدس دریا بہتا ہے جو انسانی آنکھ سے اوجھل ہے۔

گریسن کی تقسیم زبان کے مطابق شمالی ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں دو گروہوں میں بٹ جاتی ہیں ایک اندرونی اور دوسرا بیرونی۔ اندورنی زبانیں ٹھیک اس علاقہ میں بولی جاتی ہیں جس کا ذکر اوپر مدھیہ دیش کے نام سے کیا جا چکا ہے۔ بیرونی گروہ کی زبانیں نیم دائرے کی شکل میں مغربی پنجاب سے شروع ہو کر سندھ، مہاراشٹر، وسطی ہندوستان، اڑیسہ، بہار، بنگال اور آسام تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ کی کڑی صرف گجرات میں ٹوٹتی ہے۔ گجرات پر گریسن کے خیال میں متہرا والوں کا سیاسی اقتدار کافی عرصہ تک رہا۔ لہذا وہاں کی زبان مدھیہ دیش کی زبان سے اس درجہ متاثر ہوئی ہے کہ گریسن موجودہ گجراتی کو اندورنی زبانوں کی صف میں جگہ دیتا ہے۔

گریسن کی تقسیم زبان کا نقشہ

(۱) بیرونی زبانیں

(الف) شمال مغربی شاخ

۱۔ لہندا (مغربی پنجابی)۔ ۲۔ سندھی

(ب) جنوبی شاخ

۱۔ مراٹھی

(ج) مشرقی شاخ

۱۔ آسامی۔ ۲۔ بنگالی۔ ۳۔ اڑیا۔ ۴۔ بہاری بولیاں

(۲) وسطی زبانیں

۲۔ پوربی ہندی

(۳) اندرونی زبانیں

۱۔ مغربی ۲۔ پنجابی (مشرقی) ۳۔ گجراتی ۴۔ راجستھانی ۵۔ بھیلی ۶۔ خاندیشی

(۴) پہاڑی زبانیں

۱۔ مشرقی پہاڑی یا نیپالی ۲۔ درمیانی پہاڑی ۳۔ مغربی پہاڑی

اندرونی اور بیرونی زبانوں کی یہ گرہ بندی گریسن نے ہرنے کے برعکس زبانوں کی ساخت اور ان کے کینڈوں پر غور کرنے کے بعد کی ہے۔ اس کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔

(۱) دونوں گروہوں کی زبانوں میں تلفظ کا بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً اندرونی شاخ کی تمام زبانوں میں (س) کا تلفظ صحیح ہوتا ہے اسکے برعکس بیرونی زبانوں میں یہ عام طور سے (ش) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قدیم ایرانی میں یہی (س) (ہ) میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ مثلاً سنسکرت (سپت) = فارسی (ہفت) (س) (سندھ) = ف (ہند) وغیرہ۔ تلفظ کی یہ خصوصیت ہندوستان کی شمال مغربی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مغربی پنجابی اور سندھی میں (کوس) کا (کوہ) بن جاتا ہے۔ ادھر بنگالی اور مراٹھی میں (س) ہمیشہ (ش) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بلکہ مشرقی بنگالی اور آسامی میں تو یہ (چ) اور (س) کی درمیانی آواز بن جاتا ہے۔

(۲) اندرونی اور بیرونی زبانوں کے اسماء کی شکلیں بھی مختلف ہوتی ہیں، تقریباً تمام اندرونی زبانوں میں ایسے حروف سے کام لیا جاتا ہے جو الفاظ کے ساتھ جوڑ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً کا۔ کی۔ کے۔ کو۔ سے، نے وغیرہ۔ لیکن بیرونی زبانیں ان کی بہ نسبت ترقی کر چکی ہیں اور حالت تفصیلی (انالیٹکل اسٹیج) سے صورت ترکیبی (سنٹیٹک) میں پہنچ چکی ہیں۔ لسانیات کا یہ اہم اصول ہے کہ زبانیں پہلے حالت تفصیلی میں ہوتی ہیں اور اس کے بعد رفتہ رفتہ شکل بدل کر ترکیبی صورت اختیار کر لیتی ہیں، تقریباً تمام اندرونی زبانیں حالت تفصیلی میں ہیں۔ مثلاً اُردو میں حالتِ فاعلی "کا، کی کے" لگا کر بنائی جاتی ہے۔ یہاں (کا) اسم سے الگ بھی ایک معنی رکھتا ہے لیکن بنگالی (بیرونی زبان) میں یہی (ار) لگا کر بنتی ہے اور یہ علامت اس وقت اسم کا ایک جزو بن جاتی ہے۔

(۳) دونوں گروہوں کی زبانوں میں ایک اور بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے بیرونی زبانوں کے فعل ماضی سے اس کے فاعل کی تجنیس اور تعداد کا پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن اندرونی زبانوں میں ہر قسم کے فاعل کے ساتھ فعل کی ایک ہی شکل رہتی ہے، مثلاً اُردو میں (میں گیا) (تو گیا) (وہ گیا) یہاں فعل "گیا" یکساں رہتا ہے۔ لیکن بنگالی کے لفظ "ماری لام" سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ مارنے والا (میں) ہے جب کہ اُردو کے (مارا) سے پتہ نہیں چلتا کہ میں نے مارا، یا تو نے مارا، یا اُس نے مارا۔

گریسن نے اس سلسلہ میں تاریخی استدلال بہت کم پیش کیا ہے صرف مذکورہ بالا لسانی مفروضات پر

وہ زبانوں کی اس گروہ بندی کو صحیح سمجھتا ہے۔ لسانیات کی دنیا میں گریسن کی تحقیق کے اس حصہ سے جتنا اختلاف کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آریائی زبانوں کے نئے محققوں نے مبسوط لسانیاتی دلائل سے گریسن کے اس نظریہ کا بطلان پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر چٹرجی کا نام پیش پیش ہے۔ بی۔ مزمدرار کا خیال ہے کہ گریسن ہندوستان کی قدیم زبانوں سے کماحقہ واقف نہ تھا۔ اس لئے اس کے لسانیاتی فیصلے قول فیصل کا حکم نہیں رکھتے ان کا خیال ہے کہ گریسن نے اپنے نظریہ کی تائید میں فرہنگ اور صوتیات پر غیر معمولی زور دیا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ زبان کے کینڈے کو سمجھنے میں ان سے کہیں زیادہ مدد اس کے صرفی اور نحوی قاعدوں سے ملتی ہے۔ گریسن کے بعض لسانی دلائل کا بطلان :-

(۱) (س) کا (ہ) میں تبدیل ہوجانا بیرونی زبانوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ اس کی مثالیں خود مغربی ہندی (خالص اندرونی زبان) میں مل جاتی ہیں۔ جیسے :- سنسکرت : تسّیہ، تسّ، تاس، تاه، تا (تاکو۔ تاہی وغیرہ برج بہاشا میں آج بھی بولتے ہیں) اسی طرح سنسکرت :- کرشیقی، کرسیدی، کرسئی، کری ہسئی۔۔ (اپ بھرنش) گری ہے برج بہاشا میں بن جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بیرونی زبانوں میں اکثر جگہ اس کا استعمال پایا جاتا ہے مثلاً راجستھانی (کرسی) لہندا (مغربی پنجابی)۔ (کرے سی) کرے گا۔ اسی طرح تقریباً تمام جدید آریائی زبانوں میں (اندرونی اور بیرونی دونوں) اعداد کا (س)، (ہ) میں تبدیل ہوجاتا ہے جیسے گیارہ، بارہ، چوہتر (چوستر) جسے گجراتی (جسے گریسن زبانوں کی اندرونی صف میں جگہ دیتا ہے) کی بعض بولیوں میں "(س)" (ہ) میں تبدیل ہوجاتا ہے مثلاً سنسکرت : سپت، اُردو۔ سات، گجراتی، ہات۔

(۲) بیرونی زبانوں کی طرح مغربی ہندی میں بھی علامتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا، بنگالی اور مراٹھی کی طرح اس میں بھی بعض اوقات لفظ کو توڑ کر علامتوں کا مفہوم نکال لیا جاتا ہے۔ مثلاً اردو میں "آنکھوں" بمعنی "آنکھوں سے"

ع۔ خسرو واکو آنکھوں دیٹھا۔ (امیر خسرو) بمعنی آنکھوں سے دیکھا۔

پُرانی اردو میں (میں نے) کی جگہ (زیادہ تر) (میں) استعمال ہوتا تھا آپ بھرنش کی یہ روایت میرو سودا کے زمانہ تک قائم رہی ہے۔ اسی طرح اردو میں۔ وہ بھوکوں مرگیا، برج بہاشا : بابھوکن مرگیو، بہ معنی بھوک سے مرگیا، "سے" کا مفہوم ان جملوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے برعکس لہندا (مغربی پنجابی) میں جسے گریسن بیرونی زبانوں میں شمار کرتا ہے۔ علامتیں علیحدہ سے لگائی جاتی ہیں۔ مثلاً گھوڑے وا (گھوڑے کا) یا (گھوڑے نوں) بمعنی (گھوڑے کو) اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جن اصولوں کو بیرونی زبانوں کی خصوصیت گردانا گیا ہے وہ تھوڑی بہت اندرونی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بیرونی زبانوں میں بعض خصوصیات ایسی لکھی ہیں جو جنوبی اور مشرقی ہندوستان کی بیرونی زبانوں میں تو مشترک ہیں لیکن مغربی ہندوستان کی بیرونی شاخ میں پائی

جاتیں، مثلاً ان زبانوں میں ماضی مطلق کی علامت "ل" ہے (اُٹھا) کے لئے مراٹھی (اُٹھیلا) بنگالی (اُٹھیل) بہاری (اُٹھل) آسامی (اُٹھل) اڑیا (اُٹھل) اڑیا (اُٹھیلا) لیکن شمالی مغربی ہندوستان کی علامت ماضی "ل" نہیں بلکہ الف ہے۔ جیسے اٹھا، پڑا، چلا

چنانچہ ہمیں یہاں گریسن سے اختلاف کرتے ہوئے چٹرجی کی اس رائے سے متفق ہونا پڑتا ہے کہ اندرونی، بیرونی زبانوں کی تقسیم لسانی اعتبار سے اتنی ہی مہمل ہے جتنی کہ تاریخی استدلال سے۔ اب ہم ڈاکٹر چٹرجی کے لسانی نقشہ میں تھوڑی سی ترمیم کرنے کے بعد ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل طریقے پر کرتے ہیں۔

(الف) مدھیہ پردیش کی زبان خاص

(۱) مغربی ہندی

(ب) درمیانی زبانیں

(۱) مدھیہ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں۔

(۱) پنجابی ۲۔ راجستھانی ۳۔ گجراتی ۴۔ پہاڑی بولیاں

(۲) بیرونی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان۔

(۱) پوربی ہندی

(ج) شمالی مغربی ہندوستان کی زبانیں

(۱) لہندا (مغربی پنجابی) ۲۔ سندھی

(د) مشرقی ہندوستان کی زبانیں

(۱) بہاری ۲۔ اڑیا ۳۔ بنگالی ۴۔ آسامی

(ر) جنوبی ہندوستان کی آریائی زبانیں

(۱) مراٹھی

مذکورہ بالا زبانوں کی تفصیلات

شمال مغربی ہندوستان کی زبانیں

لہندا: یہ مغربی پنجاب کی زبان ہے، اس کے اور مشرقی پنجابی کے حدود کچھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ

بعض سرحدی اضلاع کے اندر دونوں میں امتیاز کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ لہندا پر دُرُ دیا پشاچ زبانوں کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے، مغربی پنجاب میں "کیکے" دیس بھی شامل ہے۔ جہاں قدیم زمانے میں پشاجی پراکرت اور برا چڈ آپ بھرنش بولی جاتی تھیں۔ لہندا مغربی پنجابی، جاٹکی، ہندکی یا اُچی کے ناموں سے بھی مشہور ہے۔ لیکن ان میں سب سے بہتر نام لہندا ہی ہے۔ اس کے معنی "سمت مغرب" کے ہیں۔ لہندا میں کوئی ادبی کارنامہ نہیں ملتا۔ یہ اپنی قواعد اور فرہنگ دونوں اعتبار سے مشرقی پنجابی سے مختلف ہے اس کا اپنا رسم الخط لندا ہے لیکن آج کل یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

(۲) سندھی : یہ صوبہ سندھ کی بولی ہے، اس کے بولنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اس میں عربی فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کیے جاتے ہیں، اس کا رسم الخط بھی عربی ہے۔ اس کی پانچ بولیاں ہیں جن میں وسطی علاقے کی "پچول" بولی نے تھوڑی بہت ادبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سندھی کا تعلق برا چڈ آپ بھرنش سے ہے۔ آریائی زبانوں میں یہ واحد زبان ہے جس پر عربی کے براہ راست اثرات پڑے ہیں۔ لہندا اور سندھی دونوں دو آبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں، اس لئے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملایا جاسکتا گو مسلمان اول اول انہیں زبانوں کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔

جنوبی ہندوستان کی آریائی زبان

مراٹھی: مہاراشٹر کی زبان ہے اس کے جنوب میں دراوڑ زبانوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں جن میں سے پونا کے اطراف کی بولی نے ادبی مراٹھی کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس کا رسم الخط دیوناگری ہے۔ ادبی سرمایہ کے اعتبار سے ہندوستان کی ممتاز ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں میں گجراتی کے علاوہ مراٹھی ایک ایسی زبان ہے جس میں صیغہ تثنیہ ملتا ہے۔ یہ پنجابی اور گجراتی کی طرح برج بھاشا کے برعکس (و) اور (ب) کے تلفظ میں فرق کرتی ہے۔ مغربی ہندی کی طرح اسماء کا اختتام اس میں بھی الف پر ہوتا ہے اور جمع (اے) جوڑ کر بنائی جاتی ہے۔ دکنی کی ساخت پر داخت میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ اس کے بعض اسماء، حرف اور افعال دکنی میں مستعمل ہیں۔ مثلاً: - کتیک = کئی ایک (قطب مشتری): بسلا = بیٹھا، بسلانا = بٹھانا، اور دکنی کے کلیدی لفظ نکو (نہیں) اور "چ" تاکید، آپیچ (آپ ہی) خداچ (خدا ہی) وغیرہ۔ دکنی میں سنسکرت اور آپ بھرنش کے الفاظ کا جو عام رجحان ملتا ہے اس کی تائید مراٹھی نے بھی کی ہے۔

مشرقی ہندوستان کی زبانیں

(۱) آسامی: آسامی پر ہندوستان کی آریائی زبانوں کا سلسلہ مشرق میں ختم ہوتا ہے۔ اُڑیا کی طرح آسامی

بھی بنگالی کی بہن ہے نہ کہ بیٹی۔ اگرچہ آسامی قواعد بنگالی سے زیادہ مختلف نہیں دونوں کے ادبی رجحانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲) بنگالی : یہ ریاست بنگال اور بنگلہ دیش کی زبان ہے۔ دیہاتی بنگالی اور شہری بنگالی میں زمین آسمان کا فرق ہے ادبی بنگالی میں سنسکرت کے خالص الفاظ کی جتنی بھرمار ملتی ہے اس کی مثال اگر ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں ملتی ہے تو وہ نئی ہندی ہے۔ ادبی زبان کی نیو بنگالی کے اس روپ پر ہے جو ہنگی کے آس پاس چوبیس پرگنہ میں بولی جاتی ہے۔ بنگالی صوتیات کی خصوصیات یہ ہیں کہ (ا) کا (او) اور (س) کا (ش) ہو جاتا ہے۔ بنگالی رسم الخط براہمی ہی کی ایک شکل ہے۔

(۳) اڑیا : یہ اڑیسہ (قدیم ات کل دیس) میں بولی جاتی ہے اس لیے اس کو اُتکلی یا اوڈری بھی کہتے ہیں۔ اڑیا رسم الخط بہت مشکل ہے اس کی قواعد بنگالی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس لیے بنگال کے پنڈت عرصہ تک اسے بنگالی زبان کی ایک بولی گردانتے رہے، لیکن یہ سیاسی مصلحت اور لسانی غلطی تھی۔ اڑیا دراصل بنگالی کے ساتھ ساتھ بارہویں صدی عیسوی میں ماگدھی اُپ بھرنش سے جنم لیتی ہے۔ بنگالی اور اڑیا کا رشتہ ماں بیٹی کا نہیں بہنوں کا ہے۔ مرہٹوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے اس میں مراٹھی کے الفاظ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

(۴) بہاری : تمدنی اعتبار سے صوبہ بہار کا تعلق یوپی سے رہا ہے، لیکن لسانی اعتبار سے اس کی بولیاں بنگالی سے زیادہ قریب ہیں، بنگالی، اڑیا اور آسامی کی طرح اس کی پیدائش بھی ماگدھی اُپ بھرنش سے ہوئی ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ ماگدھی اُپ بھرنش کی سچی جانشین ہے کیونکہ یہ اسی علاقے میں بولی جاتی ہے۔ بہاری کی تین بولیاں قابل ذکر ہیں۔

(۱) میتھلی :- جو گنگا کے شمال میں دربھنگہ کے آس پاس بولی جاتی ہے۔

(۲) مگھی :- جس کا مرکز گیا اور پٹنہ سمجھنا چاہیئے۔

(۳) بھوج پوری :- جو یو۔ پی کی گورکھپور اور بنارس کی کمشنریوں اور بہار کے شاہ آباد، چمپارن وغیرہ کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

ان میں میتھلی اور مگھی ایک دوسرے سے قریب اور بھوج پوری دونوں سے کسی قدر مختلف ہے ڈاکٹر چٹرجی، بھوج پوری کو میتھلی اور مگھی سے اس قدر مختلف مانتے ہیں کہ وہ اُسے بہاری بولیوں سے علیحدہ شمار کرتے ہیں۔ بہار میں تین رسم الخط رائج ہیں۔ لکھائی چھپائی میں دیوناگری استعمال ہوتا ہے۔ عام تحریروں میں کیتھی رسم الخط برتا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ میتھلی کہتے ہیں جو بنگالی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔ اس علاقہ کی ادبی زبانیں اُردو اور ہندی ہیں۔

مشرقی ہندوستان کی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان :-

مشرقی ہندی: مشرقی یا یورپی ہندی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مغربی ہندی کے پورب میں بولی جاتی ہے یہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے مغربی ہندی سے ملتی جلتی ہے اور بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے بہاری سے لیکن اس کا گہرا رشتہ مشرقی ہندوستان کی زبانوں (بہاری، بنگالی) وغیرہ ہی سے ہے۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں (۱) اودھی (۲) بگھیلی۔۔ (۳) چھتیس گڑھی۔ کوسلی، اودھی کا دوسرا نام ہے۔ کیلاگ اور گریسن نے سب سے پہلے مشرقی ہندی کو ایک علیحدہ زبان کی حیثیت دی ہے اس سے قبل اسے ہندی ہی کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے افعال پر مغربی ہندی کا اثر صاف نظر آتا ہے، لیکن اسماء اور ضمائر کے اعتبار سے یہ ہندوستان کی مشرقی زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مغربی اودھی میں فعل کی معمولی شکل برج بھاشا کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے، (آون، جاون، کرن) لیکن مشرقی اودھی میں فعل کے آخر میں (ب) آتی ہے۔ جیسے (آب، جاب، کرب) فعل ماضی کے لئے مشرقی ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح (س) آتا ہے۔ جیسے ماریس کیئس وغیرہ۔

مشرقی ہندی کی سب سے اہم بولی اودھی کو ہندی ادب میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اس کے دو مشہور شاعر ملک محمد جائسی اور تلسی داس ہیں جو ہندی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔

مدھیہ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں

پہاڑی بولیاں

پوربی پہاڑی: یہ نیپال میں بولی جاتی ہے۔ اس کو نیپالی، پربتیا، گورکھالی اور سکھ گراہی کہتے ہیں۔ اس کا سب سے نکھرا روپ کاٹھ منڈو کی گھاٹی میں بولا جاتا ہے۔ یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

درمیانی پہاڑی: اس کی دو شکلیں ہیں۔

(۱) کمایونی۔ جو المورہ، نینی تال کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

(۲) گڑھوالی:- جو ریاست گڑھوال اور مسوری کے پہاڑی علاقے میں بولی جاتی ہے۔

مغربی پہاڑی: اس زبان کی کئی بولیاں ہیں جو شملہ اور اس کے آس پاس کے پہاڑی علاقے میں بولی جاتی ہیں اس علاقے میں تقریباً بیس بولیاں رائج ہیں۔ ان میں تحریری ادب نہیں ملتا۔

مذکورہ بالا سب پہاڑی زبانیں راجستھانی سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں۔ خاص طور سے درمیانی پہاڑی کا تعلق ہے پوری اور مغربی پہاڑی کا تعلق مارواڑی سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اکثر راجپوت قبائل راجپوتانہ سے نکل کر یہاں بس گئے تھے۔ اسی وجہ سے یہاں کی

بولیوں پر راجستھانی زبان کا اگہرا اثر پڑا۔

گجراتی: گجراتی زبان کا ٹھیاواڑ، ریاست بڑودہ اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں بولی جاتی ہے اس کے مختلف بولیوں میں دوسری زبانوں کی طرح زیادہ اختلاف نہیں پایا جاتا۔ گجراتی زبان کا یہ نام گوجروں کی نسبت سے ہے جو ۴۰۰ تا ۶۰۰ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں باہر انھیں گوجروں کی نسبت سے پڑے ہیں۔ یہ گوجر بعد کو گجرات میں بھی جاکر بس گئے تھے۔

مغربی ہندی، راجستھانی اور پنجابی کی طرح گریسن گجراتی کو بھی اندرونی زبانوں کی فہرست میں جگہ دیتا ہے۔ دراصل گجرات کی اصل زبان بیرونی۔۔ شاخ سے تعلق رکھتی تھی جس کے بعض لسانی اثرات اب تک اس زبان میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (۱) اس اور ہ کے تلفظ کا ادا نہ کر سکتا (۲) اسماء کی غیر فاعلی حالت میں (ل) کا برقرار رکھنا (۳) ماضی مطلق میں (ل) علامت کا مراٹھی اور مشرقی ہندوستان کی زبانوں کی طرح استعمال۔

ویدی زمانہ سے موجود عہد تک گجراتی زبان کے تسلسل کی جس طرح نشان دہی کی جاسکتی ہے اس کی نظیر ہمیں ہندوستان کی دوسری زبانوں میں نہیں ملتی۔ راجپوتوں کے عہد میں متہرا والوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے جدید گجراتی اپنی قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی بالخصوص برج بھاشا سے کافی متاثر ہوئی، اسماء اور افعال کے اعتبار سے یہ مغربی ہندی کی پیروی کرتی ہے، لیکن اردو کی (ڑ) اور (ڑھ) کے مقابلے میں اس میں (ڈ) اور (ڈھ) زیادہ پائی جاتی ہیں جو دکن کی بھی عام خصوصیت ہے۔

راجستھانی: ایک طرح سے یہ مدھیہ دیش کی زبان ہی کا جنوب مغربی پھیلاؤ ہے، اس پھیلاؤ کی آخری کڑی جیسا کہ لکھا جاچکا ہے گجراتی زبان ہے۔ جس علاقہ میں آج کل پنجابی (مشرقی) گجراتی اور راجستھانی زبانیں (جن کا شمار گریسن اندرونی زبانوں میں کرتا ہے) بولی جاتی ہیں وہاں قدیم زمانہ میں بیرونی شاخ کی زبانیں رائج تھیں۔

رفتہ رفتہ سیاسی فتوحات کی بنا پر اندرونی زبانوں نے ان علاقوں کی۔۔ زبانوں کو ڈھکیلنا شروع کیا لیکن گجراتی اور پنجابی کی طرح راجستھانی میں بھی بیرونی زبانوں کے بعض نشانات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (ا) (ا) (اے) اور (او) کا تلفظ، عام تلفظ سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح (چھ) کا تلفظ (س) سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور (س) کی آواز عام طور سے (ہ) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

راجستھانی کی چار اہم بولیاں ہیں؛۔

(۱) مارواڑی یا میواڑی :- یہ جودھ پور، بیکانیر، جیسلمیر اور اودے پور کی ریاستوں میں بولی جاتی ہے

(۲) مالوی :- اس کا مرکز سابق ریاست اندور تھا۔

(۳) جے پوری :- یہ جے پور، کوٹہ اور بوندی کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔

(۴) میواتی :- یہ الور اور دہلی کے جنوب میں گورگاؤں میں بولی جاتی ہے۔ قدیم اردو کی ساخت پر داختمیں اس کا بھی حصہ رہا ہے حالانکہ اس پر تحقیق کم ہوئی ہے کیوں کہ ادبی اعتبار سے یہ بولی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اردو پر بانگروزبان کے اثرات کے سلسلے میں کسی اگلے باب میں اس کے لسانی اثرات کو بھی پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

راجستھانی کے علاقوں میں اردو، ہندی ادبی زبانوں کی حیثیت سے رائج ہیں۔ اس کا قدیم ادب زیادہ تر مارواڑی میں ملتا ہے پرانی مارواڑی اور گجراتی میں بہت کم فرق ہے۔ اس کا قدیم ادب ڈنگل (برج بھاشا پنگل) کے نام سے مشہور ہے۔ جے پوری میں ادب ملتا ہے دادو دیال اور ان کے چیلوں نے اسی میں شاعری کی ہے۔ ان چاروں بولیوں کی ساخت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جے پوری اور مارواڑی، گجراتی سے، میواتی برج بھاشا سے اور مالوی بندیل کھنڈی سے ملتی جلتی ہیں۔ راجستھان کے بیشتر افعال مغربی ہندی کی نہج پر ہوتے ہیں۔ برج بھاشا کی طرح مستقبل کے لیے اس میں بھی دو علامتیں مستعمل ہیں (ہوں) اور (گو) یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ علامت مستقبل (گ) جسے پروفیسر شیرانی پنجاب کی خصوصیت بتاتے ہیں (گو) یا (گ) کی شکل لے کر برج اور راجستھانی کی بعض بولیوں میں بھی مستعمل ہے لیکن جملوں کی ترتیب، الفاظ کی دروبست اور بعض صرفی و نحوی قاعدوں کے اعتبار سے اس میں اور گجراتی میں گہری مماثلت دکھائی دیتی ہے۔

پنجابی : لفظ پنجابی کا اطلاق عام پران تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے لے کر ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے گریسن نے اپنے لسانی جائزہ میں اس بات کو واضح کیا تھا کہ لاہور کے مغرب میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے اندرونی بولیوں سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اس زبان کو لہندا یا مغربی پنجابی کا نام دیتا ہے اور اسے بیرونی زبانوں کی فہرست میں رکھتا ہے۔ اس طرح اس نے مغربی پنجابی اور پنجابی (مشرقی) میں امتیاز کیا ہے۔ پنجابی پورے پنجاب کی زبان نہیں یہ مشرقی پنجاب، ریاست بیکانیر کے شمالی اضلاع اور ریاست جموں کے جنوبی اضلاع کی زبان ہے۔ مغرب میں یہ لہندا یا مغربی پنجابی، شمال اور شمال مشرق میں پہاڑی زبانوں اور جنوب میں باگراور بیکانیری بولیوں سے گہری ہوئی ہے۔ مشرق میں اس کے حدود مغربی ہندی کی دو بولیوں یعنی کھڑی بولی اور بانگرو (ہریانوی) سے ملتے ہیں، چنانچہ مشرقی انبالہ، کرنال، ریاست پٹیالہ ضلع حصار کے مشرقی حصے، ربتک، گورگاؤں اور ریاست دہلی کی زبان پنجابی نہیں بلکہ کھڑی بولی (ہندوستانی) یا ہریانوی ہے۔ ان علاقوں کو چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سارے مشرقی پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔ پنجابی اور مغربی ہندی کی بولیوں کے درمیان حد بندی دریا ئے گھگھر سے کی جاسکتی ہے۔ دریا ئے گھگھر کے مشرق میں چند سکھ آبادیوں کو چھوڑ کر باقی سارے علاقہ کی زبان کھڑی بولی یا بانگرو (ہریانوی) ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی "پنجاب میں اردو" لکھتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا ہے کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح پنجابی زبان کا تعلق بھی قدیم زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے نشانات جدید پنجابی تک میں ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ پنجابی کی ساخت اس بات کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس پر کسی زمانہ میں مدھیہ دیش کی زبان، جس کی نمائندہ بولیاں آج کل برج بھاشا اور کھڑی بولی ہیں، کی چھاپ نہایت گہری پڑ چکی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے ملتا ہے کہ لہندا اور پنجابی کے درمیان خط فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقے پر گھل مل جاتی ہیں کہ گریسن کو یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ دراصل کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہندا کی ایک نہ ایک شکل چھائی ہوئی تھی جسے اندرونی زبان نے پیچھے ڈھکیلنا شروع کیا اور رچنا دو آب تک ہٹا دیا اس اندرونی زبان کے نشانات لہندا میں سندھ ساگردو آب تک پائے جاتے ہیں۔ اندرونی زبان کا رنگ جوں جوں ہم مشرق کی طرف آتے ہیں گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی لیے پنجابی کو گجراتی اور راجستھانی کی طرح، ملواں، زبان مانا گیا ہے۔ گریسن نے اپنی بعد کی تحریروں میں اسے صاف طور پر زبانوں کی درمیانی صف میں جگہ دی ہے۔ اس کی تائید میں اس تاریخی حقیقت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ فتوحات کا بہاؤ ہمیشہ شمال مغرب سے دو آب کی طرف رہا ہے لیکن سیاسی اقتدار کا مرکز ہر عہد میں گنگا جمنا کے میدانوں میں رہا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے کہ دو آب کی زبانیں اپنے تنگ علاقوں سے نکل کر آس پاس کی زبانوں پر چھاپ مارتی اور چھاپ چھوڑتی رہی ہیں۔ مسلم عہد میں تو پنجاب اور گجرات کی حیثیت ہمیشہ صوبوں کی رہی ہے جو سدا مرکز سے تمدنی اور لسانی اثرات قبول کرتے رہے ہیں۔

گریسن کے خیال میں معیاری پنجابی باری دو آب کی بولی "ماجھی" ہے جس کا مرکز امرتسر ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس زبان کے ابتدائی یورپی اسکالروں نے لدھیانہ کی زبان کو معیاری پنجابی مانا ہے۔ لدھیانہ عرصہ تک انگریز مشنریوں کا اڈا رہا ہے اس لیے انہوں نے قواعد لکھتے وقت وہیں کی زبان کو ملحوظ رکھا ہے۔ مخی آواز (ل) کا ذکر ان کی قواعدوں میں ملتا ہے، ماجھی میں اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ مخی /ل/ برج بھاشا میں بھی نہیں ملتا۔ البتہ کھڑی بولی، مشرقی پنجاب اور بانگڑو (ہریانوی) کے علاقوں میں یہ سننے میں آتا ہے۔ بانگڑو سے منتقل ہو کر یہ راجستھانی میں بھی آگیا ہے۔ ادبی اردو اور ہندی میں تو اس کا استعمال گنوارو سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اردو برج بھاشا کی پیروی ہے۔

مغربی ہندی اور اس کی بولیاں

مغربی ہندی کے حدود تقریباً وہی ہیں جو مدھیہ دیش کے ہیں۔ یہ مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک، شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیا چل تک بولی جاتی ہے اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے اور جنوب مشرق میں مراٹھی اور مشرقی ہندی شمال میں یہ پہاڑی بولیوں

(جونسری، گڑھوالی اور کمایونی) سے گھری ہوئی ہے اندرونی زبان کی شاخ میں صرف مغربی ہندی ایک ایسی زبان ہے جسے ہم خالص اندرونی زبان کہہ سکتے ہیں بلکہ اگر پنجابی، راجستھانی اور گجراتی کی ملوان حیثیت پر نظر رکھیں تو اندرونی گروہ کی نمائندہ زبان محض مغربی ہندی ہے۔ مغربی ہندی کا یہ نام مدھیہ دیش کی زبان کو گریسن نے دیا ہے جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔ مغربی ہندی مدھیہ دیش کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے، کیونکہ اسی علاقہ میں سنسکرت شوریسنی پراکرت اور شوریسنی آپ بھرنش پروان چڑھتی ہیں جن کی سچی جانشین اس علاقے کی جدید بولیاں کھڑی بولی (ہندوستانی) برج بھاشا، ہریانی، بندیلی اور قنوجی ہیں جن کے مجموعے کو گریسن مغربی ہندی کا جدید نام دیتا ہے۔

لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہ راست شوریسنی آپ بھرنش سے ہے جو اس عہد کی بولیوں میں واحد اور ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی، جس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا۔ ہر عہد میں اس علاقہ کی زبان کا مرکز متہرا رہا ہے جو قدیم ہندی تمدن کا اہم مرکز تھا۔ اس سے قبل آپ بھرنش کے باب میں یں لکھا جا چکا ہے کہ یہ آپ بھرنش راجپوتی عہد میں مسلمہ طور سے لاہور سے لے کر بنگال تک ادبی حیثیت سے رائج تھی۔ قدیم بنگالی شاعری کے نمونے اس بات کے شاہد ہیں، مغرب میں اس کی شمال مغربی بولیاں (کھڑی بولی اور ہریانوی) اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر لاہور تک دھاوے مارتی تھیں جس کا نتیجہ آج ہم مشرقی پنجابی کی شکل میں پاتے ہیں۔ جنوب مغرب میں گجراتی اور راجستھانی زبانوں کو نوعیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے جو کسی زمانہ میں بیرونی زبانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن جن پر شور سینی آپ بھرنش کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ ان کا شمار اندرونی زبانوں میں کیا جاسکتا ہے۔

مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کی اپنی صوتی، صرفی اور نحوی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس زبان کو ایک علیحدہ اور ممتاز حیثیت دی گئی اور جن کا تفصیلی مطالعہ کسی بعد کے باب میں کیا جائے گا۔ لیکن مغربی ہندی کی سب سے بڑی خصوصیت کا ذکر (جو کہ اس کی تمام بولیوں کی مشترک خصوصیت بھی ہے) کر دینا ضروری ہے اندرونی زبانوں میں مغربی ہندی کی یہ ممتاز حیثیت ہے کہ اس کی قواعد کا عام رجحان تفصیلی ہے جو بعض بولیوں (مثلاً کھڑی) میں اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے اس میں صحیح معنوں میں صرف ایک زمانہ فعل کے لئے اور صرف ایک حالت اسماء کے لئے پائی جاتی ہے۔ اسماء اور افعال کی دیگر تمام حالتیں حروف، فعل امدادی اور سابقوں، لاحقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہے۔

گریسن نے مغربی ہندی کی پانچ بولیاں گنائی ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں:

(۱) کھڑی بولی یا ہندوستانی (۲) ہریانوی، جاٹویا بانگڑو (۳) برج بھاشا (۴) قنوجی (۵) بندیلی۔

شوریسنی آپ بھرنش اپنے آخری دور میں دو نمایاں شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی شکل میں افعال و

اسماء کا اختتام عام طور سے (ا) پر ہوتا ہے اور دوسری شکل میں (اُو) پر کھڑی بولی اور ہریانوی میں عام طور سے یہی شکل ملتی ہے، جو گریسن اور شیروانی کے خیال میں پنجابی سے لی گئی ہے۔ (اُو) والی شکل برج بھاشا، قنوجی اور بُندیلی میں پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے پنڈت چندر دھر شرما گلیری انہیں کھڑی بولی کے مقابلے میں "پڑی بولی" کا نام دیتے ہیں۔ اُردو نے اپنے دورانِ اتقاء میں (اُو) کی شکل کو کبھی کبھی اختیار نہیں کیا۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) (اُو) کو ترجیح دینے والی بولیاں :- (۱) برج بھاشا (۲) بُندیلی (۳) قنوجی۔

(ب) (ا) کی شکل رکھنے والی بولیاں :- (۱) ہریانوی (۲) کھڑی بولی۔

برج بھاشا

مغربی ہندی کی سب سے نمائندہ بولی یا استعارہ میں اس کی سب سے عزیز بیٹی برج بھاشا ہے۔ یہ کھڑی بولی کے مقابلہ میں شوریسنی اُپ بھرنش اور پراکرت کی سچی جانشین ہے۔ اس کا مرکز برج (متہرا) کا علاقہ ہے۔ لیکن یہ جنوب میں آگرہ، بھرت پور، دھول پور، کرولی، ریاست گوالیار اور جے پور کے مشرقی اضلاع تک پھیلی ہوئی ہے۔ شمال میں یہ گورگاؤں ضلع کے مشرقی حصص تک رائج ہے۔ اس لیے اس کا شمار بھی نواح دہلی کی بولیوں میں ہوسکتا ہے۔ شمال مشرق کی جانب یہ بلند شہر، ایٹھ، مین پوری، بدایوں اور بریلی کے اضلاع ہوتی ہوئی نینی تال کے ترائی پرگنوں تک رائج ہے۔ متہرا کی برج معیاری مانی جاتی ہے۔ دوسرے اضلاع کی برج بھاشا میں مقامی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بلند شہر کے ضلع میں یہ کھڑی بولی سے گھل مل جاتی ہے۔ جے پور میں یہ راجستھانی کے اثرات قبول کر لیتی ہے۔ شمال میں گورگاؤں کے ضلع میں اس پر میواتی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ برج بھاشا کے مشرقی اضلاع کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بعض حروف صحیح ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً خرچ کا کھچو۔ مرتا کامت اے، ٹھاکر صاحب کا ٹھکسا، نوکرانی کا نوکٹی۔

برج بھاشا کا مرکز جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، متہرا ہے، متہرا ہندو تہذیب و تمدن کا مرکز ہونے کے علاوہ سنسکرت زبان کا گہوارہ رہا ہے۔ اس لیے برج بھاشا بھی سنسکرت کی طرح کہنگی لیے ہوئے ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اس میں اسمائے غیر جنس کو برقرار رکھا گیا ہے۔ شمالی ہندی دیگر بولیوں میں یہ اب متروک ہیں۔ اس کے تاریخی اور لسانی ارتقا پر روشنی اگلے باب میں ڈالی گئی ہے۔

بُندیلی یا بُندیل کھنڈی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بُندیلی، بُندیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے اور اس کے بولنے والے بُندیلے کہلاتے

ہیں۔ جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے ہندیل کھنڈ میں باندا، ہمیر پور جالون اور جھانسی کے اضلاع اور سنٹرل انڈیا کی اکثر سابق ریاستیں شامل ہیں۔ لیکن ہندی زبان کا علاقہ اس سے زیادہ وسیع ہے اور شمال میں یہ اگرہ میں پوری اور ایڈ تک بولی جاتی ہے۔ اس کے مشرق میں پوربی ہندی کی بگھیلی بولی ہے۔ شمال اور شمال مغرب میں یہ قنوجی اور برج بھاشا سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں راجستھانی کی بولیاں رائج ہیں۔ جنوب میں اس کے حدود مراٹھی سے ملتے ہیں۔ بجز جنوب کے یہ ہر سمت میں ہم سایہ بولیوں سے گھل مل کر درمیانی بولیاں بنا دیتی ہے۔ ہندی بولی میں غیر معمولی یکسانیت ملتی ہے۔ اس میں ادب کا بھی وقیع سرمایہ ملتا ہے۔ آہا اُودل کے قصوں سے متعلق جو گیت آج دیہاتی ہندوستان کی رگوں میں خون کی رفتار تیز کر دیتے ہیں اسی بولی میں پہلے پہل لکھے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ہندی ادب کے نورتن شاعر اور تنقید نگار کیشوداس اور پدما کرکا بھی تعلق اسی بولی سے ہے۔

ہندی میں تلفظ کی بعض اپنی خصوصیات ہیں۔ اس میں حروف (اے) اور (اُ) چھوٹے ہو کر (ا) اور (اُ) بن جاتے ہیں۔ مثلاً بیٹی سے بیٹا (بیٹیا نہیں)، اور گھوڑے سے گھروا (گھوروا نہیں) جو کہ مشرقی زبانوں کی نمایاں خصوصیت ہے دوسرے حروفِ علت (آئی) عموماً (اے) میں اور (اُم) عموماً (اُ) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہی تلفظ عام طور سے ملتا ہے۔ بیٹھنا۔ کینا (کھنا)۔ تیرنا۔ ہے۔ پیسہ۔ کیسا۔ میں۔ روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں۔

حروفِ صحیح میں برج کی طرح (ڑ) عموماً میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ "پرو" دور کے "گھردا"۔ لیکن تلفظ کی سب سے نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ (ہ) ہمیشہ گرا دی جاتی ہے۔ مثلاً کئی بجائے کہی کے، او بجائے آہو۔ - بھوپالی اردو میں، تلفظ کی یہ جھلک برابر ملتی ہے۔ ایک لفظ جو اس علاقہ میں ہر جگہ مستعمل ہے۔ بہت کی بجائے بھوت ہے۔ قدیم دکنی میں یہ "بھوت" ہمیشہ اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندی میں بیٹا، گھروا، بلی وا اور چری واقسم کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

قنوجی

مغربی ہندی کی اس بولی کا نام شہر قنوج کے نام پر ہے، جو ضلع فرخ آباد میں ہے۔ قنوج کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ سنسکرت کے پُرانے ادب حتیٰ کہ رامائن تک میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ - ۵۰۰ء کے وسط میں یہ راٹھور راجپوتوں کے قبضہ میں آگیا۔ - ۱۱۹۳ء میں اس خاندان کے آخری راجہ جے چند کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے۔ اس عہد کے ادب کے نمونے ابھی تک نہیں ملے ہیں۔ اس لیے قدیم قنوجی کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

آج کل قنوجی اپنی خالص شکل میں ایٹھ، فرخ آباد، شاہجہاں پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ یہ کانپور بردوئی تک پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن کانپور میں یہ بندیلی بولی سے اور بردوئی میں اودھی سے متاثر نظر آتی ہے۔ شاہجہاں پور کے شمال میں یہ پیلی بھیت تک بولی جاتی ہے جہاں یہ برج بھاشا سے گھل مل جاتی ہے۔ اس کے مغرب اور شمال مغرب میں برج بھاشا اور جنوب میں بندیلی ہے۔ مشرق اور شمال مشرق میں یہ پوری ہندی کی اودھی بولی سے گہری ہوئی ہے۔ اس کا رقبہ چونکہ محدود ہے اس لیے اس کی قسمیں نہیں ملتیں۔ البتہ کانپور اور بردوئی کے اضلاع میں یہ ملواں شکل میں بولی جاتی ہے۔ کانپور میں جو لفظ حروفِ صحیح پر ختم ہوتا ہے اس کے آخر میں عموماً (ی) لگادیتے ہیں۔ فارسی، عربی کے الفاظ تک اس قسم کی تبدیلیوں سے نہیں بچتے۔ مثلاً بعدی (بعد) دوری (دور)۔

ادبی حیثیت سے یہ برج کی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کی اور برج بھاشا کی قواعد میں فرق بھی اتنا کم ہے کہ گریسن کو اسے علیحدہ بولی کی حیثیت دینے میں پس و پیش ہے۔ اس نے اسے علیحدہ حیثیت شہر قنوج کی تاریخی قدامت کی وجہ سے دی ہے۔ ورنہ لسانی اعتبار سے اسے برج بھاشا کی ذیلی بولی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی قواعد کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں برج بھاشا کے برخلاف (او) کی بجائے (اُو) پر ختم ہوتا ہے لیکن یہ (اُو) برج بھاشا کی بعض بولیوں میں بھی ملتا ہے۔ برج اور قنوجی دونوں میں حروفِ صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں (وا) بڑھادیا جاتا ہے۔ جیسے ہندوستانی گھر، قنوجی گھر اور گھروا۔ دوسری ہمسایہ بولیوں کی طرح قنوجی میں بھی حرفِ علت کے درمیان کی (ہ) گر جاتی ہے۔ جیسے کہی ہو کی بجائے "کئی او"۔

ہریانوی، بانگڑویا جاٹو

دہلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال، ربتک، حصار وغیرہ کی بولی ان تینوں ناموں سے پکاری جاتی ہے لیکن اس کا ہریانوی نام زیادہ موزوں ہے۔ ہریانہ مسلمانی عہد سے بھی قبل کا نام ہے۔ دہلی میں یہ زبان جاٹو کے نام مشہور ہے۔ کیونکہ اس پاس کے علاقہ میں جاٹوں کی آبادی کثرت سے ہے۔ جمنا کے شمال مغربی کنارے پر اس کا اتصال مغربی ہندی کی اک دوسری بولی (گریسن کی ہندوستانی) سے ہوجاتا ہے۔ گریسن موجودہ ہریانوی کو کھڑی بولی (ہندوستانی) ہی کی ایک شکل مانتا ہے۔ جس میں راجستھانی اور پنجابی بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ حالانکہ آگے چل کر پنجابی کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ پنجابی ایک مخلوط زبان ہے جو پرانی لہندا اور دو آبہ کی زبان کے اختلاط سے قدیم زمانے میں بنی ہوگی۔ ان بیانات کے تضاد پر تفصیلی تنقید کسی اگلے باب میں کی جائے گی۔ دراصل گریسن کے پیش نظر شمالی ہندی اردو کے قدیم نمونے نہ تھے۔ اس لیے وہ ہریانوی کی قدامت کے متعلق صحیح نتائج اخذ نہ کرسکا۔

اس کے برعکس ڈاکٹر رام پلاس شرما کا خیال ہے کہ کھڑی بولی کے شمال مغربی علاقے کی عوامی زبان علیحدہ حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ہریانوی ہی کا ایک رُوپ ہے۔ یہ علاقہ میرٹھ، مظفرنگر اور سہانپور کے اضلاع پر مشتمل ہے۔ یہاں کے عوام کی زبان ادبی ہندی اردو سے کافی مختلف ہے۔ مثلاً (RT) اس کی ہریانوی کے ساتھ مشترک خصوصیت ہے، لیکن کم از کم اردو میں اس کا استعمال کسی زمانے میں بھی نہیں ہوا ہے۔ اس قسم کے اختلافات صرف صوتیات تک محدود نہیں، صرف و نحو کی سطح پر بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لیے بار بار جو، میرٹھ اور، میرٹھی، کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ صحیح نہیں۔ دہلی اور دو آج کے دوسرے شہروں اور قصابات میں زبان کی جو معیار بندی ہوئی ہے اس میں بعد کے بہت سے لسانی عوامل کارفرما رہے ہیں جن کا تفصیلی ذکر اردو زبان کا ارتقا بیان کرتے وقت کیا جائے گا۔

ہریانہ میں نو مسلموں کی آبادی قدیم زمانے سے پائی جاتی ہے بلکہ سلطنتِ مغلیہ کے عہد تک تو یہاں ان کی کثرت تھی۔ سلاطینِ دہلی کے لشکروں میں بھرتی عام طور سے اسی علاقہ کے جنگجو قبائل سے کی جاتی تھی۔ اس علاقہ کے کئی قصابات ہانسی۔ نارنول، جھجرو وغیرہ کو سیاسی اعتبار سے مختلف زمانوں میں ہمیت حاصل رہی ہے۔ دہلی کے سیاسی انقلابات کا سب سے گہرا اثر بھی اسی علاقہ پر پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقہ کی زبان میں کافی الٹ پھیر ہوتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بعض اوقات کھڑی بولی کے افعال استعمال کیے جاتے ہیں تو کبھی کبھی پنجابی کے بھی۔ کرتا اور کہتا کے ساتھ ساتھ کرا کہندا بھی مستعمل ہیں۔ کھڑی کا "وہ جاوے ہے" بھی سنائی دیتا ہے۔ اور "وہ جا سے" بھی جنوب سے ہریانی پر برج بھاشا اور راجستھانی کی بولی میواتی بھی اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ شہر دہلی اتفاق سے ان تمام بولیوں کے سنگم پر واقع ہے اس لیے زبان کا معیار عرصہ تک متعین نہیں ہو سکا۔ البتہ میر عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات ہندی کی تصنیف کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہانسی کے نواح کی ہریانی بولی معیاری مانی جانے لگی تھی، جو جمنا پار کی میرٹھ ضلع کی کھڑی بولی (ہندوستانی) سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی تھی لیکن خان آرزو تصحیح غرائب اللغات ہندی میں میر عبدالواسع سے اختلاف کرتے ہوئے ہریانوی کے بجائے سند ہمیشہ برج بھاشا سے (گوالیری "افصح السنہ ہند") سے لیتے ہیں۔ "زبان اہل اردو" زبان اردو شاپی "با زبان اردو" (اقتباسات خان آرزو کے ہیں) کو بھی وہ بہت معیاری نہیں مانتے۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی

پچھلے صفحات میں شمالی ہندوستان کی آریائی زبانوں کی سلسلہ وار تاریخ بیان کرتے ہوئے ہم بتاتے آئے ہیں کہ کس طرح ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ آپ بھرنش ہی کے اندر جدید آریائی زبانوں کے رُوپ جھلکنے لگے تھے۔ اس عہد کے شورشین دیس (متہرا کے ارد گرد کا علاقہ) کی آپ بھرنش (شورشینی آپ بھرنش) کو ادبی حیثیت سے

بہت فروغ تھا جس کا ڈنکا بنگال سے پنجاب تک بج رہا تھا۔ چنانچہ قدیم بنگالی ادب تک میں اس کی جھلک ملتی ہے اسی شورشیں آپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا جو ۱۰۰۰ء کے قریب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کوئی زبان کسی وسیع علاقہ میں بولی جاتی ہے تو اس کی یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ جزوی اختلافات کے ساتھ کئی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مغربی ہندی بھی کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ایسی ہی بولیوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔

(۱) ہندی (۲) ہریانوی یا بانگرو (۳) برج بھاشا (جس میں قنوجی بھی شامل ہے) اور (۴) کھڑی بولی یا جسے گریسن "ہندوستانی" کا جدید نام دیتا ہے۔

مغربی ہندی کی وہ بولی جو مغربی روہیلکھنڈ دو آب کے شمالی حصہ اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بولی جاتی ہے، گریسن ا سے ہندوستانی کہہ کر پکارتا ہے۔ اس میں اور ادبی ہندوستانی (اردو) میں ماں بیٹی کا تعلق ہونے کے باوجود بیرونی اثرات کی وجہ سے بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عام طور سے بولی ہندوستانی میں ایک ہی مفہوم کے لیے کئی کئی محاورے پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کو ادبی سندھل گئی اور دوسرا مردود متروک سمجھا جانے لگا۔ قطع نظر ادبی ہندوستانی اس بولی ہندوستانی کے اندر بھی برج بھاشا اور دیگر بولیوں کی طرح بہت سے عربی، فارسی الفاظ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ وہ اس کا جزو بدن معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً مظفرنگر کے دیہات کا باشندہ ماں کے عام فہم لفظ کی بجائے عربی کے لفظ "والدہ" کو بگاڑ کر "مالدہ" کہے گا۔ اس طرح "محافظت" کو "مہوجت" انتقال کو محض "کال" اور مطلب کو "مطلبل" وغیرہ۔

ہندوستانی بولی کے حدود داربعہ کی تفصیل یوں ہے۔ گنگا کے پورب میں مراد آباد، بجنور، رام پور کے اضلاع یعنی مغربی روہیلکھنڈ۔ ان مقامات کی بولی ادبی ہندوستانی سے قریب ترین ہے۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ ان مقامات میں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے اور ان کے تمدن کا گہرا اثر رہا ہے۔ گنگا کے دوسری طرف یہ میرٹھ، مظفرنگر، سہارن پور کے اضلاع اور دہرا دون کے میدانی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ ضلع دہرہ دون کے پہاڑی علاقوں میں پہاڑی زبان رائج ہے۔ دو آب کے بالائی حصہ کی بولی بھی ادبی ہندوستانی (اردو) سے بہت ملتی جلتی ہے۔ لیکن اس قدر نہیں جتنی مغربی روہیلکھنڈ وغیرہ کے اضلاع کی۔ یہاں کی زبان میں بہت سی ایسی شکلیں رائج ہیں جو مراد آباد، بجنور اور رام پور کے اضلاع میں متروک سمجھی جاتی ہے، جمن پار کر کے پنجاب میں داخل ہوں تو جنوب سے شمال کی طرف جو اضلاع ملتے ہیں حسب ذیل ہیں :- دہلی، کرنال، انبالہ، دہلی (قطع نظر شہر دہلی) اور کرنال کے اضلاع کی زبان ہندوستانی نہیں ہے۔ یہاں مغربی ہندی کی ایک دوسری بولی جس کا نام ہریانوی بانگرو یا جاٹو ہے بولی جاتی ہے۔ اس پر راجستھانی اور پنجابی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ضلع انبالہ تک پہنچتے پہنچتے راجستھانی کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ضلع انبالہ کی مشرقی کالیا اور پٹیالہ کی بعض

تحصیلوں کی زبان ہندوستانی ہے جو پنجابی سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہے۔ مغربی انبالہ کی زبان تو بالکل ہی پنجابی ہے۔ اس علاقہ میں ہندوستانی اور پنجابی کے درمیان دریا ئے گھگھر کو خطِ فاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ کھڑی بولی یا ہندوستانی مغربی ہندی کے شمال مغربی علاقہ کی بولی ہے۔ اس کے مغرب میں پنجابی یا دلی اور کرنال کی آدھی راجستھانی ملی ہوئی بانگڑیا جاؤ زبان ہے۔ اس کے شمال میں پہاڑی بولیاں ہیں جن کا راجستھانی سے گہرا رشتہ ہے۔ جنوب اور مشرق میں یہ برج بھاشا سے گہری ہوئی ہے۔ چنانچہ گریسن نے اسے برج بھاشا کا ایسا رُوپ مانا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتا چلا گیا ہے۔ یہاں بظاہر گریسن کی تحقیقات میں تضاد نظر آتا ہے۔ اس سے قبل وہ تقسیمِ زبان کے سلسلہ میں پنجابی کو بیرونی اور اندرونی زبانوں (لہندا) اور (مغربی ہندی) کی آمیزش کا نتیجہ بتاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ کسی زمانے میں مغربی ہندی کی شمال مغربی شاخ (کھڑی بولی اور ہریانوی کی قدیم شکل نے) لہندا کو لاہور تک پیچھے ڈھکیل دیا تھا۔ چنانچہ اندرونی زبانوں کے اثرات جوں جوں ہم مغرب کی طرف جاتے ہیں، ہلکے ہوتے چلے جاتے ہیں، اس درمیانی زبان یعنی پنجابی نے مسلمانوں کی فتوحات کے وقت مدھیہ دیش کی بولیوں (ہریانوں اور کھڑی) پر اثر انداز ہوئی۔ اس طرح مغربی ہندی کی وہی پرانی خصوصیات جو کبھی لہندا کی سرزمین میں کہپ گئی تھیں مغربی ہندی کی ان بولیوں کو پھر واپس مل جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی قواعد کا وہ حصہ جسے پروفیسر شیرانی پنجابی کا اپنا بتاتے ہیں (جس کی تفصیلی بحث آگے کی گئی ہے) وہ دراصل براہ راست مغربی ہندی کی قدیم شکل (شورسینی آپ بھرنش) سے ماخوذ ہے۔ ادبی ہندوستان (اردو) اور بولی ہندوستانی میں بعض تلفظ کے بھی اختلاف پائے جاتے ہیں۔ حروف صحیح (مصمتوں میں بولی ہندوستانی میں پنجابی، راجستھانی اور ہریانوی کی طرح مخی (ن) اور (ل) کا استعمال آزادی سے پایا جاتا ہے، جو اردو کی طرح مغربی ہندی کی دیگر بولیوں برج وغیرہ میں بھی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ جمع میں حالتِ مفعولی کا اختتام اردو کے برخلاف اکثر (اں) پر ہوتا ہے جیسے دناں، عورتاں وغیرہ۔ یہ شکل ہریانوی، راجستھانی اور پنجابی میں عام ہے، دکنی کی بھی یہ خصوصیت ہے لیکن اردو اور برج بھاشا میں نہیں ملتی۔ افعال میں اسی طرح حال میں "مارتا ہوں" کے ساتھ میں "ماروں ہوں" بھی ملتا ہے۔ میں ماروں ہوں، وہ مارے ہے، یہ شکلیں راجستھانی اور ہریانوی زبانوں میں بھی ملتی ہیں اور قدیم اردو (میر و سودا) بلکہ غالب اور ذوق تک (فعل کی یہ شکلیں مل جاتی ہیں۔ آج بھی بجنور، مراد آباد وغیرہ کے اضلاع اور دہلی میں اسی طرح بولی جاتی ہیں۔ لیکن جدید اردو نثر میں متروک ہو گئی ہیں گو شعر میں ان کا رواج اب تک جائز مانا گیا ہے۔

ہندوستانی کے بارے میں گریسن اور لائل دونوں کی رائے یہی ہے کہ بولی ہندوستانی کا ڈول اور کینڈا دیگر بولیوں کی بہ نسبت برج سے زیادہ قریب ہے۔ بولی کے اعتبار سے اس کی علیحدہ حیثیت ہے۔ بعض نجی خصوصیات کی وجہ سے ہم اسے برج میں ضم نہیں کرسکتے۔ یہ قدیم زمانے سے دلی اور اس کے آس پاس کی زبان

ہے۔ قدیم سیاسی جغرافیہ میں کردراج کی زبان تھی۔ اب چاہے اسے دہلوی کھڑی بولی یا ہندوستانی کسی بھی نام سے یاد کیا جائے۔ اس کا علاقہ اور اس کی قدامت متعین کی جاسکتی ہے، اس کی شناخت آپ بھرنش عہد کے ادب میں بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ اردو زبان کے ارتقا کا براہ راست اس سے تعلق نہیں اس لیے اردو ارتقا کی داستان دکن سے شروع کریں گے جہاں پندرھویں صدی عیسوی کے وسط سے اس کے تحریری ادب کے نمونے ملتے ہیں۔ شمال میں اکبر اور جہانگیر کے عہد سے پہلے کے نمونے زیادہ معتبر نہیں، اس لیے امیر خسرو اور صوفیائے کرام کے تبرکات لسانی تجزیے کے لیے غیر اہم قرار پائیں گے۔



تیسرا باب اُردو زبان کا ارتقا شمالی ہند میں اُردو (۱۲۰۰ تا ۱۷۰۰ء)

لسانی پس منظر

اُردو زبان کی تاریخ وسیع تر معنوں میں ہند آریائی زبان کی تاریخ ہے، جسے قدیم ہند آریائی، وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کا زمانہ ۱۵۰۰ء ق۔ م سے لے کر ۱۰۰۰ء تک پھیلا ہوا ہے جب ہندوستان کی جدید ہند آریائی زبانیں لسانی ارتقا کے عمل میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ جیسا کہ پچھلے باب میں مذکور ہو چکا ہے اُردو کا سلسلہ کھڑی بولی کے توسط سے شورسینی آپ بھرنش سے ملتا ہے جو ۱۰۰۰ء کے قریب مدھیہ دیش (انبالہ تالہ آباد اور دہرہ دون تا اجین علاقہ) کی سب سے مستند زبان تھی۔ اس لئے ہند آریائی کے محققین نے اُردو کے کھڑی بولی روپ کی نشان دہی کا سلسلہ آپ بھرنش کی ادبیات سے کیا ہے۔ بقول چندر شرما گلیری "پرانی آپ بھرنش سنسکرت اور پراکرت سے ملتی جلتی ہے اور بعد کی قدیم ہندوستانی سے جس طرح اس زمانے میں لفظ گاتھا، سے مراد پراکرت ہوتی تھی اُسی طرح، دوہا، سے آپ بھرنش ملی ہوئی راج الوقت زبان کا مفہوم لیا جاتا تھا جس کی ادبیات کے نمونے ۸۰۰ء سے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔" اس عہد کی زبان کا مطالعہ حسب ذیل تصانیف پر مبنی ہے۔

(۱) وجے پال راسو (۲) ہمیراسو

(۳) کیرتی لتا (۴) کیرتی پتا کا

قدیم ہندوستانی کے مطالعے کے لئے ذیل کی کتب مستند خیال کی جاتی ہیں:

(۱) کھومان راسو (۲) بسیل دیوارسو (۳) پرتھوی راج راسو (۴) جے چندر پرکاش (۵) پرمال راسو

(آلہا کی اصل شکل) (۶) ودیا پتی پداولی

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ ادب کا بہت بڑا ذخیرہ بُدھ سِدھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب ہے جو ملک کے مشرق اور مغربی حصوں میں اپنے مذہبی گورکھ دھندے کا پرچار عوامی زبان میں کیا کرتے تھے۔ لسانیاتی اعتبار سے یہ زیادہ مستند نہیں تاہم ان کی "سُدھکری بھاشا" کا مطالعہ اس عہد کی بہت سی لسانی گتھیوں کا حل پیش کرتا ہے۔

بُدھ سِدھوں اور ناتھ پنتھیوں کے دو ہوں میں قدیم اردو کے ماضی کی شکلیں مل جاتی ہیں۔ مثلاً کہیا، پوچھیا، ماریا، بوجھیا۔ حروف میں جو، سو، جاب، (جب تک)، تاب (تب تک) عام مستعمل تھے۔ اس عہد کی سب سے اہم تصنیف ہیم چندر (۱۱۶۲ - ۱۰۸۸ء) کی قواعد "ہیم چندر شبدانوشاسن" ہے جس میں ایک دوہا نقل ملتا ہے۔ ایک راجپوت عورت اپنے شوہر کے مارے جانے کا ذکر اس فخریہ انداز میں اپنی سہیلیوں سے کرتی ہے۔

بہلا ہوا جو ماریا بہنی مہارا گنت
لجے جم تو واسیا ہو، جئے بھگا گھر و انت

(بہلا ہوا بہن! جو میرا گنت (پیارا، شوہر) مارا گیا، جو بھاگا ہوا گھر آتا تو ہم عمر سہیلیوں میں مجھے لاج آتی) اس دوہے کا پورا کینڈا قدیم کھڑی کا ہے، جس کی قواعد کی کئی شکلیں اس میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اسی عہد کی دوسری اہم تصنیف جینی عالم میروتنگ کی "پرند چنتا منی" ہے جس میں راجہ منج کا یہ دوہا درج ہے:

بانہ پچھوڑدی جاہی توہوں، ہوؤں تے دیں کا دوس
ہیا ٹھہے جئی نیس دہی جانوئی منج سروس

برج بھاشا کا اسی مفہوم کا دوہا زبان زدِ خلّاق ہے:

بانہ چھڑائے جات ہو جان کر بنل موئے
پردئے میں سے جاؤ گے تو مرد بدھوں گی توئے

ہمیرا سوکا مصنف سارنگ دھر ۱۳۱۴ء کے قریب یہ رزمیہ الفاظ لکھتا ہے:

ڈھولا ماریا ڈھلی منہ مچھیو میچھ سریر

(دلّی میں ڈھول بجایا اور ملچھوں (مسلمانوں) کے سریر (جسم) بے ہوش ہو گئے)

اُپ بھرنش کی سب سے بڑی خصوصیت، جو بعد کو جدید ہند آریائی زبانوں نے بھی اپنائی، یہ تھی کہ اس میں سنسکرت کے تَت سَم (خالص) الفاظ بہت کم استعمال ہوتے تھے مسلمانوں کی آمد نے سنسکرت کے فسوں کو اور کم کر دیا۔ اُپ بھرنش کی تصانیف کے بعد ہندی ادب کا وہ دور آتا ہے جس "ویر گاتھا کال" (رزمیہ

عہد) کہا جاتا ہے اس عہد کی طویل رزمیہ نظموں کو "راسو" کہا جاتا ہے..... ہندی ادبیات کے اس دور میں (۷۰۰ تا ۱۱۵ء) ہمیں اٹھارہ شاعروں کے نام ملتے ہیں جن میں اکرام، فیض، نرپتی نالا، چند بردائی مدھوکر، شری دھر اور شاعرہ مکتبائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس عہد کی زبان کے مطالعہ کے لئے سب سے مستند مواد نرپتی نالا کا بیسل دیوار سوار چند بردائی پرتھوی راج راسو ہے۔ نرپتی نالا کا ممدوح اجمیر کا چوہان راجہ وگرہ راج چہارم (۱۰۰۱ء) عرف بیسل دیو ہے۔ اس راسو کی زبان قدیم راجستھانی ہے لیکن اس میں عربی فارسی کے عام بول چال کے الفاظ جیسے محل، انعام، ینجا (نیزہ)، تاجنو (تازیانہ) وغیرہ در آئے ہیں۔ لیکن ہندی کے سب سے پہلے اور بڑے شاعر ہونے کا فخر چند بردائی (۱۱۹۲-۱۱۵۹ء) کو حاصل ہے جسکی مشہور و معروف تصنیف پرتھوی راج راسو ہے۔ لیکن (۱۱۹۲-۱۱۵۹ء) کو حاصل ہے جس کی مشہور و معروف تصنیف پرتھوی راج راسو ہے۔ وہ دہلی کے آخری ہندو راجہ، پرتھوی راج کا دوست، وزیر اور درباری شاعر تھا۔ پرتھوی راج راسو ڈھائی ہزار صفحے کی ضخیم کتاب ہے جس کے اکثر حصص کے مستند ہونے کے بارے میں محققین میں اختلاف رائے ہے۔ محمود شیرانی، شیامل داس جی کی رائے کی تائید کرتے ہوئے اسے ایک جعلی اور بعد کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔

پرتھوی راج اور اس کی بہن پرتھبائی سے منسوب "دان پتر" کی زبان حیرت ناک طریقے پر کھڑی بولی سے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر سمببت درج ہونے کے باوجود پنڈت اوجھا اور محمود شیرانی دونوں انہیں بھی جعلی قرار دیتے ہیں۔ ان میں کھڑی کے ماضی کی علامت (ا) اور مستقبل کی (گ) ملتی ہیں: ہووے گا، دیوے گا، کرے گا، آویں گے، جیسے جدید افعال موجود ہیں۔ ہندوستان کے لفظ کا تلفظ "ہندوستھان" (ہندو + استھان) لکھا ملتا ہے۔ ضمائر میں تم کے بجائے تم ہے جو آج بھی کھڑی کے علاقے میں عام ہے۔ عربی فارسی کے الفاظ شامل ہیں جیسے، دوا، کھجانہ (خزانہ)، پرچہ، آرام، کھرچہ (خرچہ)، ماف (معاف)، کھاتر (خطر) حرام کھوری (حرام خوری)، تکھت (تخت)، پک (حق) ثابت، اولاد، کھالس (خالص)، روکا (رقعہ)، ہاجر (حاضر)، ہجور (حضور) کاگد (کاغذ) حکم، تاکید، آرامن (آرام)۔

اردو کا آغاز:

محمد بن قاسم کی قیادت میں عرب مسلمان ۷۱۲ء میں عربی بولنے ہوئے ہوئے سندھ میں داخل ہوتے ہیں اور جدید سندھی کو جنم دیتے ہیں جس کا رسم خط ہی عربی نہیں بلکہ جس میں عربی کے ہزاروں الفاظ مدغم ہو چکے ہیں۔ تاہم سید سلیمان ندوی کا یہ خیال کہ اردو کا بیولی سندھ میں تیار ہوا تھا لسانیات کی رو سے صحیح نہیں۔ ہندوستان کی زبانوں میں عربی فارسی الفاظ کا داخلہ ہی اردو کی تخلیق کی ضمانت نہیں کرتا، بلکہ جب یہ لسانی اثرات

"زبانِ دہلی و پیرامنش" میں نفوذ کرتے ہیں تب اردو کا پہلا بیولی تیار ہوتا ہے۔ اور یہ ہوتا ہے مسلمانوں کی فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد۔ اس سے قبل مسلمان پنجاب اور لاہور میں حکمران کی حیثیت سے دو برس تک متمکن رہ چکے تھے۔ محمود غزنوی کی ۱۰۰۰ء میں فتوحات پنجاب کے بعد اس کا الحاق سلطنت غزنہ سے کر لیا جاتا ہے اور لاہور کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔ لاہور کی اسی "پنجابی - ترکی - فارسی" ادبی فضا میں مسعود سعد سلمان (م ۱۱۲۵ اور ۱۱۳۰ء کے درمیان) کا ظہور ہوتا ہے جن کے ترکی اور فارسی کے قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ "ہندی" کے صاحبِ دیوان ہونے کی شہادت حضرت امیر خسرو نے "غرة الکمال" کے دیباچے میں ان الفاظ میں دی ہے :

"پیش ازیں از شاہانِ سخن کسے راسہ دیوان نہ بودہ مگر مرا
کہ خسرو مالک کلا ہے۔ خواجہ مسعود سعد سلمان را اگر ہست
اما آں سے دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوی است۔ درپارسئی
مجرد کسے سخن راسہ قسم نہ کردہ جزم نہ کہ دریں کار قسام و
عادلہ"

اس کے بعد عونی صاحب لب الالباب نے بھی تصدیق کی ہے :

"اور اسے دیوان ست، یکے بہ تازی، یکے بہ پارسی دیکے بہ ہندوی"

چنانچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسعود سعد سلمان کسی "ہندوی" زبان میں بھی شاعری کرتے تھے اور شاید ان کا دیوان امیر خسرو کے زمانے تک (م ۱۳۲۵ء) دستیاب تھا۔ لیکن نمونے کے عدم موجودگی میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ "ہندوی" کون سی زبان تھی۔ ہمارے خیال میں یہ یقیناً امیر خسرو اور ابوالفضل کی تقسیم السنہ ہند کے مطابق "لاہوری" (پنجابی) ہوگی جو دونوں کی فہرست کی زبانِ دہلی سے یقیناً مختلف ہوگی اس لئے کہ "ہندوی" کا اطلاق فارسی کے علی الرغم شمالی ہند کی اکثر ہندوستانی زبانوں کے لیے مسلسل استعمال ہوتا رہا ہے۔

پنجاب پر غوریوں کے حملے ۱۱۶۸ء سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ۱۱۹۳ء میں بلاخر ایک شکست کھانے کے بعد شہاب الدین غوری دہلی کے آخری ہندو سمراٹ پر تھوی راج کو شکست فاش سے کر دہلی اور اجمیر پر قابض ہو جاتا ہے، جہاں اس کا سپہ سالار قطب الدین ایبک، اس کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں سلطنت غلاماں کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کی اصل تاریخ اس کے بعد ہی سے شروع ہوتی ہے۔

"دہلی و پیرامنش" کی زبان کے پہلے شاعر امیر خسرو ہیں (۱۳۲۵ - ۱۲۵۳ء) جنہوں نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کی بارہ زبانوں کے نام گنائے ہیں۔ ان میں ایک "لاہوری" اور دوسری "زبانِ دہلی و

پیرامنش " ہے۔

امیر خسرو کا " ہندوی " کا شاعر ہونا مسلم ہے ، اس لیے کہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے :
 " جزوے چند نظم ہندوی نیز نذر دوستان کردہ شدہ است ۔
 اینجا ہم بذکرے بس کردم و نظر بر آں داشتم کہ لفظ ہندوی درپارسی
 لطیف آوردن چنداں لطفے نرارد مگر بضرورت ۔ آنجا کہ ضرورت
 بودہ است آوردہ شد "

لیکن وہ اپنے ہندی کلام کو خود بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے ، صرف تفنن طبع کے لئے اس میں کہتے تھے اور دوستوں میں تقسیم کر دیتے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُن سے منسوب ریختوں ، پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی کوئی "مخطوطاتی" بنیاد نہیں ہے ۔ ان کی زبان بھی چودھویں صدی کی اردو کے مقابلے میں (جن کی جھلکیاں بعض اوقات فقروں اور الفاظ کی شکل میں صوفیاء کے ملفوظات میں مل جاتی ہیں) خاصی جدید ہے ۔ ان میں سے کچھ ٹھیٹھ کھڑی بولی میں ہیں ، کچھ خالص برج بھاشا میں اور کچھ دونوں بولیوں کی آمیزش لیے ہوئے زبان میں ان میں سے بعض پہلیاں نہ صرف لسانی ----- بلکہ تاریخی نقطہ نظر سے بھی غلط ثابت کی جاسکتی ہیں ۔ مثلاً حقے والی پہیلی ہی کو لے لیجئے ۔

گاگر تیری جل بھری ، سرپر لاگی آگ
 باجن لاگی بانسری ، نکسن لاگی آگ

شمالی ہند میں تمباکو کا رواج عہد اکبری میں ہوا ۔ ہندوستان میں اس کا سب سے پہلے رواج دکن کے عادل شاہی دربار میں ہوا ۔ وہاں سے مغل سفیر حقہ اور تمباکو کا تحفہ لے کر آگرہ آیا تھا جہاں اس کا شوق شاہی دربار اور امراء کے طبقے میں آناً فاناً پھیل گیا ۔ خان آرزو نے نوادرالالفاظ (۱۷۵۱ء) میں لکھا ہے :

" تنباکو بقول صاحب مآثر رحیمی در ہندوستان از عہد اکبر شاہ رواج
 یافتہ ۔ اول از فرنگ بہ دکن آمدہ بو دو بعد ازاں بہ ہندوستان رواج
 گرفت "

یہی صورت ان سے منسوب " خالق باری " کی ہے جسے مدلل طریقے پر لسانی اور تاریخی اعتبار سے محمود شیرانی نے رد کر کے اس کا انتساب عہد جہاں گیری کے ایک مصنف ضیاء الدین خسرو سے کیا ہے ، حالانکہ خان آرزو کی نوادرالالفاظ میں (۱۷۵۱ء) اس کا حوالہ ایک سے زائد بار " رسالہ منظومہ امیر خسرو " کے نام سے ملتا ہے ۔

خسرو کی ہندی شاعری کی "مخطوطاتی" بنیاد رکھنے والی پہلی سند ہمیں وجہی کی ، سب رس (۱۶۳۵ء)

میں ملتی ہے وجہی نے ان سے منسوب یہ، دوہرہ، نقل کیا ہے۔
 پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ
 مَنجہ چلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ
 (اے دوست تیری محبت میں میں پنکھا بن کر ڈولتی رہی ہوں۔
 مجھے اس طرح چلتے (اور) تیرے لیے (لیکھن) ہوا کرتے ایک
 جنم ہو گیا ہے)

اس کے بعد میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعر (۱۷۵۲ء) میں امیر خسرو سے منسوب یہ ریختہ ملتا ہے:
 زرگرے پسرے چو ماہ پارا
 کچھ گھڑیے، سنوارے پکارا
 نقد دل من گرفت و بشکست

پھر کچھ نہ گھڑانہ کچھ سنوارا

امیر خسرو وہی سے متعلق زمانے میں ہمیں بعض صوفیاء کے فارسی ملفوظات میں ان کی زبان سے نکلے ہوئے ہندی کے۔۔۔۔ الفاظ اور فقرے مل جاتے ہیں۔۔ اس لسانی مواد پر کلیے قائم کرنے سے قبل اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے، جیسا کہ عبدالحق نے بھی اشارہ کیا ہے، کہ ہمارے صوفیوں کا تعلق ملک کے مختلف علاقوں سے رہا ہے اور وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے تھے۔ اس لیے ہر صوفی کا قول اردو زبان کے تجزیے کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا۔ مثلاً بابا فرید شکر گنج (۱۲۶۷ - ۱۱۷۳ء) کا تعلق پنجابی کے علاقے سے تھا لیکن ان کے بعض فقروں میں پنجابی کے، دا، کے بجائے اردو، کا، ملتا ہے۔ یہی صورت شیخ حمید الدین ناگوری (۱۲۹۷ - ۱۱۹۳ء) کے ملفوظات کی ہے۔

"فرمودہ است کہ، عزیز بھلو ہوئیں برو مت ہوئیں، سب کو پیار ہوئیں۔

یہ جملہ (او) بنیاد کی راجستھانی کی چھاپ لیے ہوئے ہے اس لیے کہ ناگور کا تعلق اجمیر کے علاقے سے ہے اردو نے اپنے ارتقا میں (او) بنیاد کے اسماء صفات یا افعال کو کبھی نہیں اپنایا اس لیے اسے ہم اردو کا فقرہ نہیں کہہ سکتے۔ خیر المجالس میں شامل اردو نما فقروں کے بولنے والے صوفیہ کی جائے پیدائش اور رہائش کا تعین کیے بغیر ان سے بھی لسانی استخراج غیر علمی ہوگا۔ مثلاً ص ۲۱۶ پر علی مولا بدایونی حضرت نظام الدین اولیاء کے بارے میں، جو سن بلوغ میں قدم رکھ چکے ہیں، یہ پیشن گوئی فرماتے ہیں:

"علی مولانا چوں دید آغاز کرد بہ زبان ہندوی، ارے مولانا یہ

"بڈا ہوسی" یعنی مرد بزرگ خواہد شد۔ مولانا علاء الدین گفت،

علی از کجامی گوئی۔ گفت درد دو چیز سے می بینم، یک آنست کہ
 بزبان ہندوی گفتند "جو منڈا سا بندی سو پائیں پسری" یعنی آنکہ
 دستار برسربند داد درپائے کسے افتد۔"

پہلے فقرے میں "بڈا" کھڑی بولی کے تلفظ کے مطابق ہے لیکن "سی" کا صیغہ مستقبل ہر چند دکنی
 اردو میں مسلسل پایا جاتا ہے، اور گجراتی، مارواڑی، جے پوری اور میواتی تک میں رائج ہے مگر دہلی کی بولیوں
 سے غائب ہے۔

خیر المجالس کے ایک اور اردو فقرے

"تو میرا گسائیں، تو میرا کرتار، مجھ اس تاپ سے چھڈا"

کھڑی بولی کی قواعد کے مطابق ہے۔ "چھڈا بجائے، چھڑا، اور، مجھ، بجائے، مجھے، قدیم اردو کے عین مطابق ہے
 "زبان دہلی" کھڑی کی شکل میں نہ صرف مسلمان لشکریوں اور صوفیوں کے ذریعے چارکھونٹ
 ہندوستان میں پھیل رہی تھی بلکہ چودھویں صدی عیسوی تک نرگن بھکتوں کے ذریعے رابطے کی زبان حیثیت سے
 دکن تا پورب اس کی تگ و تاز میں آچکے تھے۔ مہاراشٹر کے دور دراز گوشے میں بیٹھ کر مراٹھی کے بھکت شاعر
 نامدیونے (۱۴۰۸ء - ۱۳۱۸ء) اس سے کام لیا ہے۔ وہ اپنے پیغام کو عمومیت دینے کے لئے مراٹھی کو ترک کر کے کبھی
 کبھی اسے بھی اپنے لئے ذریعہ ابلاغ بناتے ہیں:

مائی نہ ہوتی، باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کا یا

ہم نہیں ہوتے، تم نہیں ہوتے، کون کہاں تے آیا

چند یہ نہ ہوتا، سور نہ ہوتا، پانی پون ملا یا

شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہوتا، کرم کہاں تے آیا

کس قدر صاف کھڑی بولی ہے۔

پورب میں یہی زمانہ کبیر داس کا ۱۵۱۵ء - ۱۴۴۰ء ہے۔ ہر چند کبیر نے کہا ہے

میری بولی پوربی تاپے نہ چنئے کوے

میری بولی سومکھے جو پورب کا ہوئے

لیکن کبیر کے کلام، بالخصوص ساکھی کے دو ہوں میں ایک ملی جلی زبان ملتی ہے جس میں کھڑی بولی
 کے روپ بھی جھلکتے ہیں مثلاً افعال کی شکلیں: جانا، مانیا، پائیا، بجھائیا، جو دکنی اردو سے بھی مخصوص ہیں
 اور ہریانوی اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع میں آج تک رائج ہیں۔ البتہ زبان دہلی کے اٹھارویں صدی کے
 نمونوں میں نہیں ملتیں۔

(۱) کبیر کہتا جات ہوں، سنتا ہے سب کوئے

رام کہہ بھلا ہوئے گا، نہیں تو بھلا نہ ہوئے

(۲) آؤں گا، نہ جاؤں گا، مروں گا، نہ جیوں گا

گرو کے سب رَم رَم رہوں گا

(۳) کبیر من نرمل بھیا جیسا گنگا نیر

(۴) کبیر لوٹنا ہے تو لوٹ لے، رام نام ہے لوٹ

پھر پاچھے پچھتا ہو گئے، پران جائیں گے چھوٹ

(۵) کبیر میرا مجھ مینہ کچھ نہیں جو کچھ ہے سوتیرا

تیرا تجھ کو سو نپے کیا لا گئے میرا

(۶) کبیر کورری کوری جور کے جورے لاکھ کرور

(۷) کبیر ہر کا سمرن چھاڈ کے پالیو بہت کٹنب

ان اشعار میں کھڑی کے کئی روپ ملتے ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی میں شمال تادکن عام ہو چکے تھے۔
 /گ/ سے مرکب صیغہ مستقبل (مروں گا، جاہیں گے، ہوئے گا وغیرہ)۔ ہائے زائدہ کے ساتھ افعال (پچھتا ہو گئے،
 جاہیں گے، ہوئے گا وغیرہ)۔ ہائے زائدہ کے ساتھ افعال (پچھتا ہو گئے جاہیں گے جو دکن اردو سے لے کر اٹھارویں
 صدی تک کی زبان دہلی میں پائے جاتے ہیں) 'ہوا، کے، بھیا، کا ماضی (جو قدیم اردو میں جا بجا ملتا ہے)۔ 'چھوڑ،
 کے بجائے چھاڈ (ڑ، پر، ڈ، کو ترجیح جو قدیم اردو کی عام خصوصیت ہے حالانکہ 'پوربی بولی' سے یہ بعید ہے)
 اردو زبان کی تشکیل کا دوسرا پہلو یعنی عربی فارسی الفاظ کی آمیزش کا رجحان بھی کبیر کے یہاں موجود
 ہے۔ محمود شیرانی کے بقول کبیر کے کلام کے دس فی صد الفاظ اس نوعیت کے ہیں:

انداجا (اندازہ)، آجائیں (عذاب)، اکھلاس (اخلاص)، اپھترا (افترا)، اکتیار (اختیار)، اُجو (وضو) کتیب
 (کتاب = قرآن)، کرم، کریم، کاجی (قاضی)، کلف (قفل)، کھلک (خلیق)، کھسم (خصم)، تریکت (طریقت) دگائی
 (دغائی = داغنے سے)، دپھتر (دفتر)، دمامہ، درگاہ، درحال، دروگ (دروغ)، جردرو (زردرو)، دستگیری، دُنی (دنیا)،
 دوجک (دوزخ)، نوبت، نار، نی بگ (کم بخت)، نسانہ (نشان)، پروردگار، پریسانی (پیشانی)، پلپیت (پلید)، پلپیتا
 (فلپیتا)، پاکم پاک، پاساری (پاسداری)، پُرجا پُرجا (پرزہ پرزہ)، بیگامبر (پیغامبر)، پھرمان (فرمان)، پھکر (فکر)،
 پھرمائی (فرمائی) بندگی، بندہ، بکھسی (بخشش)، برکس (برکت)، بیدار، بھستی (بہشت)، مجلس، مَرَدَن (جمع
 مَرَد)، مسکین، مسیت (مسجد)، میا نے (میان، درمیان)، میرحمت (مرحمت)، مُلاں (مُلا)، رباب، رحمانا
 (رحمن، رجم (رجعت)، روجا (روضہ)، صد، صبور، سالار (سہو)، ثابت، ستاب (شتاب)،

سہر (شہر)، سُنّت، سیکھ (شیخ)، حک (حق)، حجری (حضور)، ملال، ہوائی، حال، گور۔
اسی طرح فارسی کے اکثر محاورے جو اردو کے ذریعے رائج ہو گئے تھے، ان کے کلام میں موجود ہیں،
مثلاً نوبت زدن کبیر نوبت آپنی دس دن لیہو بجائے

تیشہ برپا زدن پانو کلہاڑی ماریا مور کھ اپنے ہاتھ

ہندی شعرا میں پندرہویں صدی کی، ہندوستانی، کی سب سے مستند شکل ہمیں کبیر ہی کے کلام میں ملتی ہے۔ اس وقت تک کھڑی بولی رابطے کی زبان کے طور پر ایک کل ہند حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کبیر کے دوپے پورب سے لے کر پنجاب تک عام مقبول تھے جس کا ثبوت گرو گرن ڈ صاحب، سکھوں کی مقدس کتاب ہے، جس میں کبیر کے کلام کو بڑی صحت کے ساتھ محفوظ کر دیا گیا ہے۔

"زبانِ دہلی" پورب اور دکن کے علاوہ پنجاب میں بھی اپنا گھر کر رہی تھی، اس کا بین ثبوت گرو گرن ڈ صاحب میں شامل، گرونانک (۱۵۲۹-۱۶۶۹ء) کا کلام ہے جو "جپ جی" کے نام سے موسوم ہے۔ لسانی نقطہ نظر سے ان کا یہ کلام اسی سلسلے کی کڑی ہے جو نامدیو اور کبیر جیسے سنتوں سے شروع ہوتا ہے، یعنی ایک طرف فارسی عربی کے عام مروجہ الفاظ کی آمیزش اور دوسری جانب ان لسانی اثرات کو قبول کرنا جو دہلی کے سر چشمے سے پھوٹ کر ہندوستان میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ گرونانک کا بیشتر کلام ان کی مادری زبان پنجابی میں ہے۔ کچھ اشعار شعر کی روایتی زبان برج میں بھی مل جاتے ہیں۔ لیکن وہ بھی کھڑی بولی کی ہم گیریت سے نہ بچ سکے۔ بعض لسانی خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) ان کے کلام میں پنجابی کے حروفِ اضافت (دا۔ دی۔ دے) کے ساتھ کھڑی کے (کا۔ کی۔ کے) استعمال کیے گئے ہیں (ص ۳۰)

(۲) تطویلِ مَصَوْتہ کی بھی مثالیں موجود ہیں: 'لک، کے ساتھ، لاکھ، (ص ۳۹۶)، پچھے، کے ساتھ، پچھے، (ص ۱۴)۔ اُپر، کیساتھ، اُپر، (ص ۳۶۵)

(۳) (ڈ) کے ساتھ ساتھ (ڑ) کا استعمال (ص ۳۹)

(۴) افعال میں کھڑی اور دکنی اردو کی طرح وچارنا (ص ۱۵)، نکسنا (نکلتا) (ص ۲۵)، بوجھنا (ص ۲۶)۔

قدیم اردو میں، سمجھنا، کے لئے، بوجھنا، کا فعل رائج رہا ہے، بھاؤنا، سماؤنا (ص ۲۹)، پتیا (ص ۳۰)

(۵) والا، کا لاحقہ مابعد کا ارتقا ہے، دکنی اردو کھڑی، ہریانی اور برج میں ہمیشہ "ہارا" آیا ہے جیسے،

جانہارا، پنہارا (ص ۴۲)

(۶) کچھ ضمائر بھی مشترک ہیں مثلاً: دِن (= اُن ص ۲۔ دہلی اور اس کے نواح میں اب تک رائج ہے)۔

تیرے (ص ۱۰) میرے (ص ۱۲)، تیری (ص ۱۳) ہماری (= ہماری، ص ۱۴)، تمہارے (ص ۱۴)، ہمارا (ص ۲۰)

عربی فارسی کے لفظ بھی، تلفظ کے پیر پھیر کے ساتھ بہ کثرت ملتے ہیں، نمونہ کلام:

آوت کو جاتا کہیں، جاتے کو آیا

پر کی کراپنی کہیں، اپنو نہیں بھایا

میٹھے کو کڑوا کہیں، کڑوے کو میٹھا

دانے کو نندا کر ہیں، ایسا کل مانہی دیٹھا

مذکورہ بلاسطور سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ بابر کی فتح دہلی (۱۵۲۶ء) سے قبل ہی شمالی ہند میں ایک رابطے کی زبان کا ہیولی تیار ہو چکا تھا، یہ زبان اس علاقے کی دوسری بولیوں کو متاثر کر رہی تھی۔ تغلقوں کے عہد میں دہلی کے بازاروں میں ہریانہ کی آبادی کا جمگھٹ تھا۔ لودھی درالسلطنت کو دہلی سے اٹھا کر برج بھاشا کے علاقے میں آگرہ لے گئے۔ بابر کا دربار لگا ہوا ہے، ایسے میں ابراہیم لودھی کا سرکاٹ کر سامنے لایا جاتا ہے۔ اس وقت کوئی ہندی شاعر کہہ اٹھتا ہے:

نو سے اوپر تھا بتیسا پانی پت میں، بھارت دیسا

اٹھیس رجب سکر بارا بابر جیتا، براہیم ہارا

(یعنی ۹۳۲ھ تھی، اٹھویں رجب، جمعہ کا دن تھا جب پانی پت، بھارت دیس میں بابر جیتا اور ابراہیم ہارا)

ان اشعار کی زبان کا تجزیہ کیجئے تو اس کی قدامت پر صاد کرنا پڑتا ہے۔ بتیسا (بتیس ۳۲)، دیسا (دیس)، اٹھیس (اٹھویں) رجب (رجب)، سکر بارا (شکر وار = جمعہ)، ہریانوی کی صوتیات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

لسانی نقطہ نظر سے سترھویں صدی کے اواخر کی سب سے اہم تصنیف محمد افضل، افضل کی بکٹ کہانی (بارہ ماسہ) ہے افضل کے سنہ پیدائش کا علم نہیں لیکن ان کے انتقال کی تاریخ علی قلی خاں والہ داغستانی کے ذکر بحیثیت فارسی شاعر کے کیا گیا ہے (۱۰۳۵ھ مطابق ۱۶۲۵ء درج ہے۔ افضل کی بکٹ کہانی کے سلسلے میں پہلا مستند اشارہ اکرم ربہ کی المتخلص بہ قطبی کے "تیرہ ماسہ" میں ملتا ہے جو ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۱ء ۱۷۳۰ء بھی افضل کے تقریباً ۱۰۵ برس بعد لکھا گیا ہے، جس میں افضل کے "بکٹ افسانہ" اور اس کے وطن نارنول (ہریانہ) کا ذکر ہے؛

پریم قصہ ہوا ہے آخر یارو تیرہ ماسہ بھی اس کے تاں پچارو

بارہ ماسا ہوئے تھا اور سب کے تیرہ ماسہ ہوا جاکر قطب کے

بکٹ افسانہ کا ہے یہ تو بھیا دونوں کے تاں جنا ہے دوئی میا

اولیں افضل کہ جس کا نا نو گوپال کیا ہے، نارنولی صاحب جمال

افضل کے وطن بارے میں مختلف تذکرہ نگاروں نے پانی پت (والہ داغستانی) تھانسیر (تذکرہ آفتاب عالم

تاب، قبل ۱۸۷۸ء) جہنجہانہ (قائم) اور نارنول (ہریانہ) بتایا ہے۔ اس میں سب سے قدیم شہادت کی رو سے نارنول ہی اس کا وطن قرار پاتا ہے، اس لیے ہریانوی کے علاقے کا باشندہ تسلیم کیا جانا چاہئے۔

۳۲۵ اشعار پر مشتمل یہ بارہ ماسہ شمالی ہند کی اردو کا پہلا مربوط اور مسلسل کارنامہ ہے جس میں بارہ ماہ سے کی ہندوستانی روایت اور خسرو کی ریختہ گوئی کے تجربے دونوں کی آمیزش ملتی ہے۔ اس کی زبان ایک طرف برج بھاشا کے گیتوں کی زبان کی سرحدیں چھو لیتی ہے تو دوسری طرف بعض اشعار اور مصرعے خالص فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ افضل کے سامنے شمالی ہند میں اردو شاعری کی کوئی روایت یا نمونہ نہیں تھے، بجز اس کے کہ وہ ریختہ گوئی کے اسلوب سے واقفیت رکھتا تھا۔ ۱۶۰۰ء تک دکن میں اردو شاعری کا جو سرمایہ جمع ہو چکا تھا اسکا بھی اسے کوئی علم نہیں تھا اور ہوتا بھی کیوں کر اس لیے کہ اکبر اور جہاں گیر، جن کا زمانہ اس نے دیکھا، اس وقت فتوحات دکن میں مصروف تھے اس لیے لشکریوں کی آمدورفت کے علاوہ ہر قسم کے تہذیبی لین دین کے دروازے مسدود تھے۔

بکٹ کہانی کی زبان مجموعی طور پر ایک سیال لسانی کیفیت کی غماز ہے۔ اس کی بنیادی بولی تو کھڑی ہے لیکن برج بھاشا اور فارسی نے اسے بری طرح جکڑ رکھا ہے۔ اس کا لسانی تجزیہ کئی وجوہ سے ضروری ہے۔ "بکٹ کہانی" کی زبان عہد اکبری کی کھڑی بولی کا وہ روپ ہے جو دہلی اور اس کے نواح سے نکل کر برج، اودھی اور ہریانوی کے علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ مولف، پنجاب میں اردو، نے لکھا ہے "اس کی زبان دکنی سے مختلف اور صاف ہے" لسانی اعتبار سے افضل کی زبان کو جدید اردو سے قریب تر ہونا بھی چاہیئے۔ دکنی اردو تیرھویں اور چودھویں صدی کی "زبان دہلوی" ہے جس کی اساس کھڑی بولی کے مقابلے میں جمنا پار کی ہریانوی اور میواتی (راجستھانی بولی) بولیوں پر قائم ہے۔ دہلی اور اس کے نواح میں زبان کا یہ کینڈا پندرھویں صدی کے وسط تک رہا۔ سنہ ۱۵۰۴ء کے قریب جب سکندر لودھی نے راج دھانی کو دہلی سے آگرہ منتقل کیا تو لسانی مرکزِ ثقل ہریانوی اور کھڑی کے علاقے سے برج بھاشا کے علاقے میں منتقل ہو جاتا ہے۔ افضل کا تعلق اکرم ربتکی کی قدیم ترین شہادت کے مطابق قصبہ نارنول (ہریانہ) سے تھا، لیکن افضل کی زبان ہریانوی کے اس قدر بھی اثرات نہیں رکھتی جس قدر کہ اس عہد کے دکنی مصنفین (محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، عبدل) کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ کھڑی بولی عہد اکبری میں برج بھاشا کے زیر اثر ایک ایسی لسانی کروٹ لے چکی تھی جس نے اسے جدید بنادیا تھا۔ افضل کی بکٹ کہانی اس جدید اردو کا پہلا ادبی و لسانی نقش ہے۔ مجموعی طور پر افضل کی زبان سور داس کی برج اور کبیر داس کی، سدھگری، زبان کے برعکس کھڑی بولی کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جس کی تربیت آگرہ کے بازاروں میں ہو چکی تھی بکٹ کہانی کی زبان پر فارسی کے علاوہ برج بھاشا کے بھی اثرات واضح ہیں، برج پندرھویں اور سولہویں صدی میں ادبی زبان کی حیثیت سے نمایاں مقام

حاصل کرچکی تھی بلکہ کرشن بھکتی کی تحریک کے ذریعے شمالی ہند کے بڑے حصے میں مسلم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ مزید کہ افضل کو اپنے قیام متہرا کے دوران کرشن بھکتی کی زبان کا بھرپور تجربہ حاصل ہوچکا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ افضل نے اپنے بارہ ما سے کے لیے ہریانوی کا انتخاب نہیں کیا۔ اس کے یہاں ہریانوی کی پٹ اس قدر بھی نہیں ملتی، جیسا کہ بعد کے ہریانوی ادیب اکرم ربّتی کے "تیرہ ماسہ" میں ملتی ہے۔ جو بکٹ کہانی کے تقریباً سو برس بعد کی تصنیف ہے، ہریانے کے دوسرے مصنف اور لغت نگار عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات ہندی بھی اٹھارویں صدی کے چوتھے دہے کی تصنیف ہے، اسکی زبان (جس کی تصحیح خان آرزو نے ۱۷۵۱ء میں نواذر الالفاظ میں کی ہے) اور افضل کی زبان میں خاصا فرق ہے۔ غرائب اللغات کی، کوزیت، ہائیت اور غیر ہائیت، اور، انفیت، بکٹ کہانی میں نہیں پائی جاتیں:

(الف) صوتی خصوصیات

(۱) تطویل مصوتہ ہانسی (ہنسی، پاتی (پتر، خط)

(۲) ل/ل/پر/ر/ کو برج کے زیر اثر ترجیح: گر(گل، اگلا)، کاری(کالی) سانورا(سانولا)، جرنّا (جلنا)، ڈارنا

(ڈالنا)

(۳) عربی فارسی اصوات کا ہندی تلفظ: لر(لرزا)، داگ (داغ)

(ب) صرفی خصوصیات

(۱) اسمائے ضمیر: تیں (تو)، تمری (تمہاری)، تمن (تم)، ہوں (=میں)۔ محمد قلی قطب شاہ کی

ریختیوں میں ملتا ہے اور خالص برج ہے،) ہہمن (ہم)، کنہیں (کسی)

(۲) "اں" کی جمع کی بعض مثالیں: دھوپاں (دھوپ کی جمع)، سیراں (سیر کی جمع) بکٹ کہانی میں

عام طور پر جمع "وں" سے بنائی گئی ہے۔ "ن" کی جمع، جو برج بھاشا میں رائج ہے صرف کہیں کہیں ملتی ہے مثلاً پگن (پگ (پاؤں) کی جمع)

(۳) افعال کی صرف بعض شکلوں میں برج کے اثرات نمایاں ہیں بھئی (ہوئی)، ردوت، سلگت، بھرت،

مرت، دیکھن، ہنسن، کھیلن

(۴) کیتا (کیا)، کینا (کیا)، دینا (دیا) کی شکلیں بھی مل جاتی ہیں۔

کیتا، دکنی اردو میں عام رائج رہی ہے۔

(۵) افعال کے مصادر، جدید اردو کے برعکس، (و) کے اضافے سے بنائے گئے ہیں۔ آونا، بھاونا،

شرماؤنا، یہ ان سے ماخوذ افعال کی دیگر شکلوں میں بھی ملتا ہے۔ ایسے افعال اٹھارویں صدی کے وسط بلکہ اس کے بعد تک رائج رہے ہیں۔

(۶) حروف کی بعض قدیم شکلیں ملتی ہیں جن میں سے بیشتر برج بھاشا کی ہیں : سُون، سِیں، سییتی، کون، اجھوں، کِت (کہاں)، مون (میں) کہا (کیا)، کوْلُو (کب تک)، کاں لگ (کہاں تک)، کہوں (کہیں) (۷) پنجابی کا صرف ایک حرف دوبار استعمال ہوا ہے نال (=ساتھ)

ع پیا کے نال بیٹھیں ساریاں سب
ع بجاوین دف پیا کے نال ساری
(ج) نحوی خصوصیت

(۱) ایک آدھ مثال ایسی بھی ملتی ہے کہ اگر اسم مونث جمع ہے تو صفت بھی جمع لائی گئی ہے۔

ع پیا کے نال بیٹھیں ساریاں سب
ع بہ عالم پھولیاں پھلواریاں سب

اس خصوصیت کا سلسلہ اٹھارویں صدی کے وسط تک چلتا رہا۔

اسی زمانے کی تصنیف "خالق باری" ہے جو امیر خسرو سے منسوب ہوتی آئی ہے لیکن جس کا اصل مصنف محمود شیرانی کے خیال میں ایک گمنام ملائے مکتب ضیاء الدین خسرو ہے جس نے 'حفظ اللسان' کے نام سے نصاب الصبیان کے طور پر اسے عہد جہاں گیری میں ۱۰۳۱ھ مطابق ۱۶۲۱/۲۲ سنہ عیسوی میں "چند کلماتِ عربی و فارسی رابزبان ہندی گوالیاری کہ درباب روزمرہ رانا گزیراست" ترتیب دیا تھا۔ خالق باری کی زبان افضل کے بارہ ما سے کی زبان سے خاصی مختلف ہے، ضمائر اور افعال کی بھی بعض ایسی شکلیں ملتی ہیں جو دکنی اردو میں تو ملتی ہیں لیکن شمال میں انہیں متروک ہوئے عرصہ ہو گیا تھا

صوتی خصوصیات :

(۱) تطویل مَصَوْتہ کی مثالیں ملتی ہیں : پاٹی (پٹی) پاگ (پگ) چاکھنا (چکھنا) کیلی (کلی)، بیلی (بلی)

بیچھو (بچھو) پاتھر (پتھر) موکی (مکی) کوتا (کتا)، چالنی (چھلنی) ماٹی (مٹی)، کال (کل)

(۲) مصوتوں کو انفیاء نے کا رجحان کثرت سے ملتا ہے۔

چمکنا، ہنسنا، چاندنی، کہنیں (کہنی)، تانا بانا (تانا، بانا) توں، کوں، پانیں، رونکھ (روکھ)،

(۳) ہائے مخلوط (نَفْسِی آوازوں) کا استعمال قَلت سے ہوا ہے۔

بھوک، مورک (مورکھ)، پڑناں (پڑھنا)، تیڑی (تیڑھی) چولا (چولہا)

(۴) غیر ضروری ہکارت (نفسیت) کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں۔ پالکھی (پالکی)

نحوی خصوصیات :

ضمائری کی حسب ذیل شکلیں قابل توجہ ہیں :

(۱) واحد متکلم کے لیے برج (گوالیاری) کے، ہوں، کا استعمال

خواہم گفت کہوں گا ہوں	خواہی گفت کہے گا توں
خواہم رفت جاؤں گا ہوں	خواہی رفت جاوے گا توں
خواہم نشت بیٹھوں گا ہوں	خواہی نشت بیٹھے گا توں
خواہم زد، ہوں ماروں گا	خواہی زد توں مارے گا
خواہم دوید، دوڑوں گا ہوں	خواہی دوید، دوڑے گا توں

یہ طویل اقتباس دینے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ ایک تو، ہوں، کے تلفظ کا برون، توں، یقین ہو جائے، مزید یہ کہ انفی، توں، کی ضمیر واضح ہو جائے۔ ضمناً (و) سے مرکب افعال کے شکلیں نمایاں ہو جائیں :

جاوے گا، دھوے گا، دیوے گا، وغیرہ

ضمائری کی دیگر شکلیں جو خالق باری میں ملتی ہیں یہ ہیں :

آپس (آپ ۹۱)، توں (تو)،

(۲) افعال میں امدادی فعل کے طور پر، آپے، (= ہے) بکثرت استعمال ہوا ہے : آپے :

ع مغز آپے گود گلیم است کاملی (۱۰۰)

ع ریدلید گھوڑے کی آپے (۸۶)

(۳) ماضی مطلق کی ترکیب (۱) کے علاوہ (یا) کے ساتھ بھی ملتی ہے

ترابگھتم، میں تجھ کہیا کجا بماندی، توں کت رہیا

(۴) "جیونا" اور "پیونا" مصادر کے طور پر استعمال ہوئے ہیں (۸۴)

خالق باری کی زبان انفیت، تخفیف مصوتہ اور مشدد الفاظ کے نقطہ نظر سے مائل بہ قدامت ہے۔ لیکن یہ فرق اس عہد کے ایک لغت نویس اور شاعر کی زبان کا فرق ہے۔ دراصل کسی زبان کے ارتقا کی داستان کا انحصار اس زبان کے عہد بعہد کے تحریری ادب پر ہوتا ہے جو اس عہد کی بول چال کی زبان سے بہر صورت مختلف ہوتا ہے۔ لیکن تاریخی لسانیات کے ماہر کا یہی کچھ سرمایہ ہوتا ہے جس سے وہ لسانی نتائج کا استنباط کرتا ہے۔

سترہویں صدی ختم ہوتے ہوتے ہمیں اس عہد کی عوامی زبان کی سب سے بڑی دستاویز یعنی روشن علی کے عاشور نامہ سے سابقہ پڑتا ہے جسے اس نے سہارن پور، یعنی ٹھیکہ کھڑی بولی کے علاقے میں بیٹھ کر لکھا تھا۔ عاشور نامے کی زبان سترہویں صدی عیسوی کے اواخر کی وہ عوامی زبان ہے جو مغربی اتر پردیش کے

بالائی دو آب میں رائج تھی۔ بالائی دو آب آج چاراضلاع پر مشتمل ہے۔ شمال سے چلئے تو سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ اور نوتراشیدہ ضلع غازی آباد (جو پہلے ضلع میرٹھ میں شامل تھا) ملتے ہیں۔ روشن علی ایک ملائے مکتب اور کم سواد تک بند ہے جو "فائدہ عام" اور "ذاتی ثواب" کی خاطر واقعہ کربلا کو منظوم کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنی زبان کو کہیں بھی 'ریختہ' نہیں لکھتا بلکہ "ہندی" "ہندی زبان" "زبان ہندوی" اور زبان ہندوستانی (ع زبان ہندوستانی میں بولا عیاں: شعر ۳۵۱۷) کے نام سے یاد کرتا ہے۔

صوتی خصوصیات :

(۱) صوتی نقطہ نظر سے عاشورہ نامے کی سب سے نمایاں خصوصیت روایتی قواعد کی اصطلاح میں حرف کو ساکن سے متحرک بنادینا ہے جسے، اضافہ مصوتہ، کہا جاسکتا ہے:

شکل، رَحْم، نَظْم، اَصِل (قافیہ دل) طِفْل، مِصْر، عَقْل، ذِکْر، شَنَاخْت وغیرہ۔ تخفیف مصوتہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں: تلاب (تالاب)، جناوار (جانور)

(۲) اس کے برعکس کبھی کبھی پنجابی لہجہ کے مطابق تخفیف مصوتہ کا رجحان بھی ملتا ہے جسے متحرک کو ساکن کردینا کہتے ہیں:

صِفْت، طَرْف، عَرَب، قَسَم، ان تلفظات کا التزام ہر جگہ ضروری نہیں۔ دوسری جگہ صِفْت ۱۲ اور مِصْر بھی ملتے ہیں۔

(۳) ایک اور اہم صوتی خصوصیت مصوتوں کا انفی کردیتا ہے جو قدیم اردو میں عام طور پر پائی جاتی ہے اور جسے اکثر مرتب، املا، کی غلطی خیال کرتے ہیں۔ (مراثی ریختہ اور متقدمین شعرائے اردو کے یہاں بھی بکثرت موجود ہے)

فاطماں (قافیہ عیاں)، سناں (قافیہ بیاں) = سنا، کہناں (قافیہ پنہاں) = کہنا، کوئچ در کوئچ (کوچ در کوچ) ناں (=نا، نہ قافیہ عثمان)، دیاں (دیا)، ناناں (نانا)

(۴) اس کے برعکس انفی مصوتوں کو غیر انفی بتادینے کا رجحان بھی جا بجا ملتا ہے، انفیاء نے کی مانند غیر انفی بنانے کا رجحان بھی شوریسینی اپ بھرنش کی دین ہے۔

کوا (کنواں) ما (ماں) (دونوں لفظ اسی املا کے ساتھ قصہ مہر افروز و دلبر میں بھی ملتے ہیں (۱۷۵۴ء) بلکہ "ما"، تو میرامن (۱۸۰۲ء) تک کے یہاں موجود ہے)

(۵) سہارن پور، مظفر نگر اور میرٹھ مشدد الفاظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے "اضلاع مشددہ" کہے جاتے ہیں:

کُل، ابن، حُر، جگہ (دوسرے مقام پر جاگہ بھی آیا ہے)، اِتی (اتنی)

(۶) قدیم اردو کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ اس میں درمیانی /ہ/ گرا دی جاتی ہے اور نفسی آوازیں اپنی /ہ/ کھودیتی ہیں۔ عاشورنامہ میں یہ دونوں خصوصیتیں بہ کثرت ملتی ہیں:

توئی (توہی)، نیئس (نہیں)، وو (وہ) (قافیہ دو) کاں (کہاں)،

ع کہاں سیقتی آئے گا کاں ہوگا۔ سات (ساتھ)، چلنی (چھلنی) اس کے برعکس

ہائے زائدہ کی مثالیں بھی ملتی ہیں: تڑپنا (تڑپنا)، دوکھا (دھوکا) مہوں (منہ)،

موہری (موری)

صرفی خصوصیات:

(۱) اسماء کے سلسلے میں سب سے قابل ذکر بات صیغہ جمع سے تعلق رکھتی ہے۔ عاشورہ نامہ میں (اں) سے مرکب صیغے دکنی اردو کے برعکس صرف عربی فارسی الفاظ کے ملتے ہیں مثلاً

مرسلاں، شہیداں، مردماں، سواراں، دینداراں، ظالماں، کافراں، کوفیاں، مومنناں،

قدرتان، موذیاں، ملکاں (ملائک)

یہ سب لفظ مفرد آئے ہیں۔ صرف ایک ہندی لفظ ہے جس کی جمع (اں) سے بنائی گئی ہے:

پکھالاں (شعراں ۳)۔ باقی ہر جگہ ہندی الفاظ کی جمع (-وں) کے اضافے سے بنائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ فارسی الفاظ کی جمع بھی اکثر (وں) سے ملتی ہے مثلاً شہیدوں، گناہوں،

کوفیوں۔ (اں) کی جمع جو دکنی اردو کی عام خصوصیت ہے، سترھویں صدی کے اختتام تک (وں) کی جمع کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے۔

(۲) تذکیر و تانیث کے سلسلے میں عاشورنامہ کی زبان جدید اردو سے اکثر مقامات پر مختلف ہے۔ مثلاً عربی کے تائے تانیث پر ختم ہونے والے ذیل کے الفاظ روشن علی نے مذکر باندھے ہیں:

خلافت، مصلحت، سکونت، شہادت، زیارت، قیامت، بشارت، رفعت ان کے علاوہ ذیل کے الفاظ بھی مذکر استعمال ہوئے ہیں:

خَلْق، تصدیق، خبر، فکر، فجر، ندا، جفا، جزا،

(۳) عاشورنامے کے بیشتر اسمائے ضمیر موجودہ اردو کے مطابق ہیں۔ البتہ چند ایسے ہیں جو قدیم اردو کی باقیات کے طور پر نہ صرف اس عہد میں بلکہ اٹھارویں صدی عیسوی کے مصنفین تک کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

ہمنا (ہمارے)، ہمن (ہم)، تمہن (تم)، تمہری (تمہاری)، تین (تو)، تمن (تم)، ہم (ہمارے)

مثلاً ہم (پاس) وو (دو کے ساتھ قافیہ)، دے (جمع وہ)، انہوں کو (ان کو)، اونے (اُن نے)، اُپس

(اپنے)، کو (کوں)، تم (تُم)، (قافیہ ہم اور ضم۔ ہریانوی اور کھڑی کا عام تلفظ)، دِن (اُن)، یہ
(یہ جمع)

(۴) عاشور نامے کے افعال کی شکلیں کم و بیش وہی ہیں جو اٹھارویں صدی کے نصف اول تک رائج

رہیں اور آج بھی عوامی زبان میں سنی جاسکتی ہیں۔ ہر چند فصیح تسلیم نہیں کی جاتیں:

لیوے، ہووے، سووے، دیوؤ، لیو، ہیگا، کروں ہوں، رو دیں، آوتا

فعل کی ایک قدیم شکل جو اٹھارویں صدی میں متردک ہو گئی تھی، اتھا (تھا) اور اتھی (تھی) ہے۔

یہ عاشور نامہ میں شاذ مل جاتی ہے۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مطابق یہ اس عہد کے مراٹھی

ریختہ میں بالکل نہیں ملتی۔

بعض اوقات روشن بولیوں کے افعال کا بھی استعمال کرتا ہے، مثلاً حضرت محمدؐ جبرئیل سے پوچھتے

ہیں: ابابکر اور عمر عثمان ہوئیں

فرشتے نے بولا کوئی ناں ہوئیں

ہوئیں = برج بھاشا ہوئیں (= ہونگے)

حروف اور متعلق فعل:

(۱) ان کی خاص شکلیں حسب ذیل ہیں:

آگا (آگے)، بہتر (قافیہ سخت تر)، کدہی (کبھی)، لک (تک)، تائیں اتا (اتنا)، کیتے (کتے)،

منے (میں)، سوں (سے)، موں (میں) نے (سے)، سیقی (سے)، سقی (سے)، اِنی (اتنی)

کوں (کو) اتے (اتنے)، بہوت (بہت)،

(۲) اضافت اور واو عطف ہندی اور فارسی الفاظ کے درمیان لائے گئے ہیں لیکن بہت کم

فرہنگ

فرہنگ کے لحاظ سے عاشور نامے کی زبان خاصی جدید ہے۔ متروک ہندی الفاظ کی جو کثرت دکنی

اردو کے ادیبوں کے یہاں ملتی ہے اس کا یہاں فقدان ہے۔ بکٹ کہانی کی طرح فارسی کے الفاظ کی

آمیزش سے بھی عاری ہے۔ یہ ایک عوامی بولی کا روپ ہے جس کا مالوہ کی مالوی بولی سے دور کا

بھی واسطہ نہیں۔ موجودہ اردو کے نقطہ نظر سے حسب ذیل متروک الفاظ قابل توجہ ہیں: گپت،

پرگھٹ، ادھک، سرساں (پیشانی)، جیو، اچرج، نرنکار، ٹھور، بچن، کھیت (میدان جنگ)، ہو

(عورت)، اگن، نار (عورت) منس (منیشہ)، مرگ (ہرن)، ایکلا (اکیلا)، نیر (پانی)، مرَم (بھید)،

جناوار (جانور)، قبیلہ (گھروالی)، خلافت (خلافت)، بیان وار (تفصیل واریہ لفظ بار بار آیا ہے)، عجب (عجب)، بگال (بغل)، تگا (تاگا)، چلاکی (چالاکی)، رگت (خون)، روپنا (سامنے کرنا)، زبیر (لاغر، دکھی۔ یہ لفظ بار بار آیا ہے)، شور شار (ہنگامہ)، صفا (صاف)، غفلت (غفلت)

نحوی خصوصیات :

نحوی اعتبار سے عاشورنامہ کی زبان پر فارسی اس قدر اثر انداز نہیں جس قدر کربل کتھایا "مراثی ریختہ" کی زبان میں ملتی ہے۔

(۱) نے، فاعلی کا استعمال بے ترتیب طور پر ملتا ہے، کبھی محذوف ہے

ع میں محنت سے پالاتھا دل خواہ کو

کبھی موجود ہے: ع بہت سے دلا سا خلیفہ نے کی

(۲) علامت مفعولی، کو، کو بھی حذف کر دیا جاتا ہے مثلاً مجھ = مجھ کو

روشن علی بی کے معاصر اسمعیل امروہوی ہیں جن کا سال وفات ۱۴۱۱/۱۲ء متعین کیا گیا ہے جن سے دو مثنویاں یاد گار ہیں :- "وفات نامہ بی بی فاطمہ" اور معجزہ انار" جن کا سنہ تصنیف علی الترتیب ۱۶۹۲ء اور ۱۴۰۸ء ہے اسمعیل امروہ کے رہنے والے تھے لیکن بہ سلسلہ ملازمت ان کا دکن (اورنگ آباد) میں قیام ۲۰، ۲۵ سال تک رہا تھا۔ ہر چند مثنوی کے مرتب، نائب حسین نقوی نے انہیں "دلی کی دو قدیم ترین مثنویاں" کہا ہے انہیں اس وقت تک روشن علی کے عاشورہ نامہ کا علم نہیں تھا (تاہم لسانی اعتبار سے ان کا سلسلہ اورنگ آبادی اردو سے ملتا ہے نہ کہ شمالی ہند کی ٹھیٹھ اردو سے۔ اس لیے لسانی استنباط کے لیے اس کی زبان کو مستند نہیں مانا جاسکتا۔ مثلاً اسمعیل امروہ کا باشندہ ہو کر "چ" تخصیصی کا استعمال کرتا ہے مثلاً آسیکا چ (اس کا ہی)۔ کہیں /چ/ کے بجائے /ج/ کا بھی استعمال ہے جو اسی کی گجراتی شکل برائے تاکید ہے۔ روشن علی کی طرح اس کے یہاں (-وں) کی جمع بھی متعین نہیں ہوئی ہے اس لیے (ان) کی جمع کا خاصا استعمال ہے۔ ماضی کی قدیم شکلیں لائیا، ڈھونڈھیا، پائیا، جائیا، آئیا، کھائیا، توڑیا وغیرہ ملتی ہیں جن سے اس عہد کی "زبان دہلی" عاری ہو چکی تھی۔ یہی صورت اسمائے ضمائر اور اکثر حروف کی ہے۔ اسی لیے ہم نے اسمعیل کی زبان کا اپنے تجزیے کے لیے وسیع پیمانے پر استعمال غیر ضروری سمجھا۔ اسمعیل کی ان مثنویوں کی موجودگی سے بہر حال ایک امر مسلم ہو جاتا ہے کہ عہد عالمگیر کے اورنگ آباد اور شاہجہاں آباد (دہلی) کی زبان میں بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ اسی لئے ایک شاعر جس کی جوانی کی ساری عمر عالمگیر کے لشکر کی حیثیت سے نواح اورنگ آباد میں گزری ہو جب اپنے وطن امروہ میں بیٹھ کر (جو خالص کھڑی اور معیاری اردو کے ضلع مراد آباد کا ایک مردم خیز قصبہ ہے) مثنویاں لکھتا ہے تو اسے یہ اعتماد ہے کہ اپنی شاعری کے لیے جو زبان وہ استعمال کر رہا ہے وہ شمالی ہند کے ادبی حلقوں میں شرف

قبولیت پاسکے گی۔ غیر شعوری طور پر وہ بہت سے ایسے الفاظ اور قواعد کی شکلیں لکھ جاتا ہے جنہیں وہ ولی کی روایت شعر کے مطابق سمجھتے ہوئے شمال اور دکن دونوں مقامات کے محاورے کے مطابق سمجھتا ہے۔ اور یہ اُسی پر کچھ نہیں موقوف، دہلی کے متقدمین شعرائے اردو آبرو، فائز، حاتم، ناجی اور یک رنگ کب ولی کے لسانی اثرات سے محفوظ رہے حالانکہ ان میں سے کسی نے اپنے زندگی کے ایام دہلی کے باہر نہیں گزارے تھے۔

سترہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے عہد عالمگیری کے ایک اور مصنف شاہ سید برکت اللہ پیمپے مارہروی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ان کے ہندی کلام کا مجموعہ "پیم پرکاش" (سنہ تصنیف ۱۶۹۸ء) کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس میں زیادہ تر، دوہے، اور، کبت، ہیں جو روایتی "زبان شعر" برج میں لکھے گئے ہیں۔ لیکن شاہ صاحب نے بہ مقتضائے زمانہ چند "ریختے" بھی لکھے جو صاف اس زبان میں ہیں جو افضل کی بکت کہانی میں استعمال کی گئی ہے۔

گھر تَج کے جا جنگل میں پری تب سمجھ پری
تن من میں پیم کی آگ بری تب سمجھ پری
موجوں کے پھیر کو جو دل غیر بوجھتا
جب سندھ کے بہنور میں پری تب سمجھ پری
تکیہ جو مخملی و دگر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیرِ سیس دھری تب سمجھ پری
جِت تِت پھرے سے من کو تسلی نہ کچھ بھئی
جب دل کی کیل مانجھ آری تب سمجھ پری
کنج خفی میں وصل ہوئی فکر و غم نہ تھا
جب ہیا میں لگائی چھری تب سمجھ پری
بوجھا نہ عشق بازِ خرد، راہ پیم کا
جب عشق سُدھ بُدھ پری، تب سمجھ پری

شاہ پیمپے کا مذکورہ بالا ریختہ برج کے لہجہ کے باوجود (پری پری) اری (اڑی) جِت تِت، ہری کھڑی کے سانچے میں ہے۔ ان کے ریختوں کا تجزیہ کیجئے تو وہ زبان کے حسبِ ذیل مرکبات کی شکل میں ملتے ہیں:

(۱) کھڑی بولی + عربی فارسی الفاظ

(۲) برج بھاشا + فارسی کے مصرعے / نصف مصرعے

(۳) کھڑی بولی + فارسی کے مصرعے / نصف مصرعے

ان ریختوں کے لیے غزل کی ہیئت استعمال کی گئی ہے یعنی مطلع ہے، قافیہ ردیف کا التزام ہے اور آخر میں مقطع ہے، بحر بھی اردو فارسی کی ہے۔ ایک ریختہ مستزاد میں بھی ہے۔

۱۷۰۰ء تک ریختہ کی شکل میں کھڑی بولی اردو کا ادبی ارتقا ہو چکا تھا۔ شاہ جہاں کی ۱۶۲۸ء میں آگرے سے دہلی واپسی کے بعد، زبان دہلی، کو مہمیز لگتی ہے لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اورنگ زیب، فتوحات دکن کی تکمیل کے لیے درالسلطنت کو عملی طور پر اورنگ آباد لے گیا اور زندگی کے آخری بیس پچیس سال وہاں اس طرح گزارے کہ ۱۷۰۷ء میں دکن ہی کی خاک کا پیوند ہو گیا۔ اس کی فتح بیجاپور (۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) کے بعد دکن اور شمال کے منقطع تہذیبی رشتے ایک بار پھر استوار ہو گئے۔ ولی اورنگ آباد سے چل کر ۱۷۰۰ء میں دہلی آئے۔ سراج اورنگ آبادی اور اسماعیل امرہوی جیسے سیکڑوں خاندان اور اشخاص اورنگ آباد جاکر بس گئے یا طویل مدت وطن سے دور وہاں ملازمت میں گزاری۔ اس زمانے میں اورنگ آباد اور شاہ جہاں آباد (دہلی) میں ادباء اور شعرا کی اس قدر آمدورفت تھی کہ لسانی اعتبار سے اورنگ آباد دہلی کا ایک محلہ سا معلوم ہوتا تھا۔ کچھ تعجب نہیں کہ دہلی کے متقدمین نے بار بار، ریختے، اور، معشوقِ دکن، کا ذکر کیا ہے۔

دکھنی پسر کے زخمِ حمائل کوں سرکٹا

بولا کہ میں گُتا ہوں تیرا اور گلے پٹا (آبرو)

خوگر نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ گوئی کے

معشوق جو ہے اپنا باشندہ دکن کا تھا (میر)

آئیے اب ہم اس دکھنی پسر، اور، باشندہ دکن، کی زبان کی جانب رجوع کریں جس نے ۱۷۲۰ء میں ولی کے دیوان کی آمد کے بعد، شاہجاں آباد، کے ایوانوں اور گلی کوچوں میں تہلکہ سا ڈال دیا تھا۔

دکن میں اردو (۱۳۰۰ تا ۱۷۰۰ء)

تاریخی پس منظر

پچھلے صفحات میں، دستیاب لسانی مواد کی روشنی میں اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کیا جا چکا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم شمالی ہند میں اردو کی داستان کا سرا ۱۷۰۰ء کے بعد اٹھائیں، بہتر ہوگا اگر یہ دیکھیں کہ اس زبان پر، وطن سے دور ملک دکن میں کیا گزری۔ فتوحاتِ دکن کا سلسلہ فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کے سو برس بعد علاء الدین خلجی کی فتوحات سے ۱۲۹۵ء میں شروع ہوتا ہے اور ۱۳۱۶ء یعنی اس کی وفات تک جاری رہتا ہے جب کہ اس کا سپہ سالار ملک کا فور اس کا علم مدورائی اور تنجور تک پہنچا دیتا ہے۔ اس کا داخلہ دکن دولت آباد سے شروع ہوتا ہے جو مراٹھی کے علاقے میں واقع ہے۔ اس کے بعد ورنگل کی نوبت آتی ہے، جو تلگو کا علاقہ ہے

اس کے بعد کنٹر اور تمل زبانوں کے علاقے اس کی زد میں آجاتے ہیں اور خسرو کے، دھور سمندر اور، معبر، ترک شہسواروں کی گرد سمند پہنچ جاتی ہے، اس طرح کہ دکن میں "ترک" مسلمان کا مترادف ہو جاتا ہے اور ان کی دہلی سے لائی ہوئی زبان "ترک ماٹا" (مسلمانوں کی بولی) بن جاتی ہے۔

شاہانِ دہلی کا دکن سے شغف اس قدر بڑھ جاتا ہے اور وہاں کا "ہُن" اس قدر عزیز ہو جاتا ہے کہ ۱۳۲۷ء میں محمد بن تغلق نے یہ ضروری سمجھا کہ اپنا دارالسلطنت تغلق آباد (دہلی) سے منتقل کر کے دولت آباد لے جائے۔ ہر چند سیاسی سطح پر یہ تجربہ، دیوانگی، کے مترادف رہا لیکن اس کے ادبی ولسانی نتائج بہت دور رس ثابت ہوئے اور خسرو کی "زبانِ دہلی" دکن کے دور دراز علاقوں میں فاتحین اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے پھیل گئی۔ ۱۳۴۷ء میں دکن کے امیرانِ صدہ نے (جو شمال سے گئے ہوئے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے) سلطنتِ دہلی کے خلاف بغاوت کی اور دو سال کے اندر علاء الدین بہمن شاہ کی قیادت میں ایک خود مختار ریاست یعنی سلطنتِ بہمنہ کی داغ بیل ڈال دی۔ اس کا مرکز پہلے دولت آباد (مراٹھی کے علاقے میں) رہا لیکن بہت جلد منتقل ہو کر گلبرگ (کنٹر کے علاقہ کا شہر) بنادیا گیا۔ رفتہ رفتہ گولکنڈہ اور تلگو بولنے والے دیگر علاقے بھی بہمنی سلاطین کے زیرِ نگیں آ گئے۔ اس طرح "زبانِ دہلی" جو یہاں ہندی، ہندوی کے ناموں سے یاد کی جاتی تھی تین زبانوں (۱) مراٹھی (۲) کنٹر اور (۳) تلگو کے علاقوں پر فاتحین کی زبان کی حیثیت سے مسلط ہو گئی۔ ان تینوں زبانوں میں سے مراٹھی کا تعلق ہندوستان کے ہند آریائی خاندانِ السنہ سے ہے جس سے ہندی (زبانِ دہلی) کا بھی تعلق ہے۔ خاندانی مماثلت کی بنیاد پر مراٹھی سے اچھالین دین رہا۔ مراٹھی نے بہت سے عربی فارسی کے الفاظ (بالخصوص عدالتی، انتظامی اور درباری) قبول کیے اور مراٹھی سے پراکرت کے ایسے الفاظ جن کے سرشتے شمالی ہند کی بولیوں سے جاملتے تھے بآسانی، زبانِ دہلی، میں آمیزش کر لیے گئے۔ کنٹر اور تلگو زبانوں کا تعلق دراوڑ (دراویدی) خاندانِ السنہ سے ہے جو ہند آریائی سے بالکل مختلف ہے۔ لہذا ان زبانوں سے بہت کم لین دین ہوسکا۔ بول چال کی زبان سے قطع نظر تحریری زبان میں بہ مشکل چند الفاظ محاورات کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ اس لیے مراٹھی کے علاقے میں زبانِ دہلی میں جو تبدیلیاں ہو گئی تھیں (مثلاً "چ" تاکید، حرفِ نفی "نکو" یا بعض پراکرتی الفاظ)، اسی شکل میں ہندی / ہندوی کے نام سے یہ زبان ان علاقوں میں پھیل گئی۔ ابتدا میں صرف شمال سے آئے ہوئے خاندان ا سے گھریلو زبان کی حیثیت سے استعمال کرتے تھے۔ سلطنتِ بہمنہ کی سرکاری درباری زبان فارسی رہی پچلی انتظامی سطحات پر مقامی زبانوں کو بھی استعمال کیا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ دہلی کے سرچشمے سے دور ہوجانے کے بعد اور فارسی زبان کے ان علاقوں بہت محدود پیمانے پر استعمال کی وجہ سے، اول اول صوفیہ نے اپنی تلقین کے لیے "ہندی" کو وسیلہ اظہار بنایا اور مذہبی اور صوفیانہ موضوعات پر نظم و نثر میں چند رسائل تصنیف کیے۔ انہیں میں ایک رسالہ "معراج العاشقین" ہے جو عرصے تک خواجہ بندہ

نواز گیسو دراز سے منسوب رہا۔ اردو زبان کے پہلے نمونہ کی حیثیت سے بہت شہرت پا گیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لسانی تجزیہ کے نقطہ نظر سے پہلی "مخطوطہ بنیاد" تصنیف جس سے ہم دوچار ہوتے ہیں فخر دین نظامی کی "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" ہے جو ۱۴۲۱ء اور ۱۴۳۵ء کے درمیان کی تصنیف ہے یہ غالباً بیدر میں لکھی گئی ہے اس لیے کہ احمد شاہ ولی نے گلبرگ کی طرح بیدر بھی کنٹر کے علاقے میں ہے لیکن سرحدی شہر ہونے کی وجہ سے اس علاقے میں مراٹھی کے اثرات ہمیشہ نمایاں رہے ہیں۔ "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" میں اردو زبان کا جو چہرہ ابھرتا ہے وہ تیرھویں صدی عیسوی کی زبان دہلوی کا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شمال میں اس زبان کے مستند نمونے نہیں ملتے۔ شمال میں پہلا مستند نمونہ افضل کی بکت کہانی میں ملتا ہے جو نظامی کی مثنوی کے دو سو سال بعد کی تصنیف ہے، جس وقت دکن میں دکنی اردو محمد قلی قطب اہ، وجہی، غواصی اور عبدل کے ہاتھوں ادبی اور لسانی دونوں اعتبار سے اپنے بام عروج کو پہنچ چکی تھی۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اس زبان میں لکھی گئی ہے جب ابھی اردو پر پراکرات کے قدیم الفاظ کی چھاپ گہری تھی۔ شمال میں ان بولیوں کی آنکھ مچولی بالآخر ایک معیاری زبان کی شکل اختیار کرتی گئی اور پراکرت کی ڈگر سے فارسی کی روش پر آتی گئی۔ دکن میں بولیوں کا تازہ خون نہ ملنے کی وجہ سے اس زبان میں ایک طرح سے جمود اور یکسانی سی آگئی۔ فارسی کے بھی سرچشمے دور تھے اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ سترھویں صدی کے بعد اس کی کیا صورت ہوتی کہ زبان دہلوی اپنی نئی شکل میں عالم گیر کے لشکروں کے ساتھ آن دھمکی اور رفتہ رفتہ دور آصف جاہی میں اردو کی جدید شکل اس کی قدیم شکل کی جگہ لیتی چلی گئی ہر چند بول چال کی زبان میں قدیم اردو (دکنی) کے محاورے کا اب تک چلن ہے، بلکہ اسکی بعض شکلیں مثلاً "یا" سے مرکب ماضی (چلیا، پڑیا، ہلیا) جو حیدر آباد کی اردو سے معدوم ہو گیا ہے دکن کے دور دراز اور دور افتادہ علاقوں میں آج تک سنائی دیتا ہے۔

نظامی کی مثنوی کدم راؤ پدم راؤ (۱۴۲۱ تا ۱۴۳۵ کے درمیان کی تصنیف) کے علاوہ لسانی تجزیے کے سنگ میل کے طور پر ہم نے خاص طور پر حسب ذیل کتب کا انتخاب کیا ہے۔

- (۱) اشرف بیانی: نو سرپار (۱۵۰۳ء)
- (۲) محمد قلی قطب شاہ: کلیات (م: ۱۶۱۱)
- (۳) کلمۃ الحقائق: بریان الدین جانم (قبل ۱۵۸۲ء)
- (۴) عبدل: ابراہیم نامہ (۱۶۰۳ء)
- (۵) وجہی: قطب مشتری (۱۶۰۹ء)
- (۶) غواصی: کلیات اور سیف الملوک و بدیع الجمال (۱۶۲۵ء)
- (۷) وجہی قطب مشتری (۱۶۰۹ء) اور سب رس (۱۶۳۵ء)

(۸) ابنِ نشاطی : پھول بن (۱۶۵۵ء)

(۹) نصرتی : گلشنِ عشق (۱۶۵۷ء)

(۱۰) نصرتی : علی نامہ (۱۶۶۵ء)

اس بنیادی کتب کے علاوہ دکنی اردو کے وافر ذخیرے سے ضرورت کے مطابق مزید مثالیں لے کر درج کی گئی ہیں۔

صوتی خصوصیات

(۱) تخفیفِ مصوٰتہ، یعنی بڑے مصوٰتوں کو چھوٹے مصوٰتوں میں بدل دینا مثلاً

آسمان (= آسمان) ع نہ بہیں پرد سے اور نہ آسمان میں (ق م)

ہت (= ہات) ع کنگن ہت کیا دیکھناں آرسی (ک پ)

ہت (= ہات) ع چلی لے کے چہب سوں پکڑہت میں ہات (گ ع)

بند (= بوند - س ر)، بدل (= بادل، ک م ق ق)

آچل (= آچل، ک م ق ق)، سرج (= سورج، ان)

گھنس (= کھانس، ک م ق ق)، پرت (= پریت - س ر)

پہل (= پھول - س ر)، چہلے (= چہالے - س ر)، سنا (= سونا - س ر)

گنگے (= گونگے - س ر)، گھنگھٹ (= گھونگھٹ - س ر)، ہتھی (= ہاتھی - س ر)

(۲) تطویلِ مصوٰتہ یعنی چھوٹے مصوٰتوں کو بڑے مصوٰتوں میں بدل دینا، مثلاً

کال (= کل) ع نہ گھال آج کا کام توں کال پر (ک پ)

آپنا (= اپنا) ع سکھی آپنا جیو تو سب جہان (ک پ)

ساچ (= سیچ، ک پ)، پاتھر (= پتھر، ک پ)

ماٹی (ک پ، ن ہ)۔ یہ لفظ دکنی اردو میں مسلسل اسی طرح آیا ہے،

پہار (= پھر، ن ہ)، لاگا (ن ہ) ناپیں (ن ہ)، لوہو (ن ہ)،

کوتا (= کتا، ک پ) چھوپ (= چھپی س ر)، جاگا (= جگہ، س ر)

چاکھنا (س ر)، موٹھی (= مٹھی - س ر)، چت کا برا (= چتکبرا - س ر)

(۳) مصوٰتوں کا انفیانا

دکنی اردو اور شمال کی قدیم اردو کا یہ نہایت قوی رجحان رہا ہے جس کی باقیات اب تک شمالی اردو

کی بول چال میں پائی جاتی ہے۔

بولنان ع سو بولیا تجھے ونہ تھا بولنان (ک پ)
 بونٹی ع نہ جھاڑی نہ بونٹی ڈرے باؤ کون (ک پ)
 توں (ن ہ)، کون (ن ہ)، سپناں (ن ہ) تیں (س ر) پیچھیں (س ر)، کوئچے کوئچے (س ر)، مُنچ (=مچ -
 س ر)

(۴) انفیت کا حذف : جو مذکورہ بالا رجحان کے بالکل برعکس ہے

ما (= ماں - س ر)، کو آ (= کنواں - س ر)، موچھیاں (= موچھیں - س ر)، گوانا (= گنوانا - س ر)
 (۵) الف مکسورہ (مصوّتہ) کا تلفظ دراویدی صوتیات کے تحت (ی) کیا جاتا ہے۔ یہ بول چال کی دکنی اردو میں
 عام ہے جیسے یم - یے (= ایم - اے) تحریری دکنی اردو میں بھی مل جاتا ہے۔ یکیلے (= اکیلے - س ر)، تیا (اتا بمعنی
 اتنا - س ر) بیک (= ایک - س ر)
 (۶) نفّسیت (ہکارت) کا حذف

چرّنا (= چڑھنا - س ر) دھونڈنا (= ڈھونڈنا - س ر)
 سوکا (= سوکھا - س ر)، انجو (= انجھو - س ر)، اپی (= ابھی - س ر)
 انگوٹی (= انگوٹھی - س ر)، باندنا (= باندھنا - س ر)، بی (= بھی - س ر)
 پرکنا (= پرکھنا - س ر)، تماری (= تمہاری - س ر) پگتا (= پگھلتا - س ر)
 (۷) نفّسیت کا اضافہ :

الٹھانا (= الٹانا) "ایک بادشاہی کو الٹھانا ہے" (س ر)
 سنگھاتی (= سنگاتی) "ہمت مرداں کی سنگھاتی" (س ر)
 پھتر (= پتھر - س ر)، پنکڑیاں (= پنکڑیاں - س ر)
 جگھڑا (جھگڑا - س ر)

(۸) کوز آوازوں کو دندانی میں تبدیل کر دینا

جب ایک ہی لفظ میں دو کوز آوازیں آتی ہیں تو پہلی دندانی بن جاتی ہے۔
 دھنڈنا (= ڈھونڈنا - س ر)، تٹنا (= ٹوٹنا - س ر)
 دانٹنا (= ڈانٹنا - س ر)، دھنڈورا - س ر)
 داڑھی (= ڈاڑھی - س ر)

(۹) دکنی اردو کی ایک مسلسل صوتی خصوصیت (شمال میں بھی یہ گاہے گاہے مل جاتی ہے)

"ق" کا "خ" میں تبدیل کر دینا ہے۔ اس کا الٹا بھی بول چال میں سنائی دیتا ہے یعنی، خبر، کا، قبر، لیکن

تحریر میں نہیں ملتا۔ مثالیں اَخل (=عقل۔ س ر)، خطرہ (=قطرہ۔ س ر)

صرفی خصوصیات:

(الف) اسم کیفیت: دکنی اردو میں اردو کے متداول اسمائے کیفیت کے علاوہ کچھ مخصوص شکلیں بھی ملتی ہیں:

(۱) مرکب بہ اسم: بھائی پنا (س ر)، دشمنی (دہ)

(۲) مرکب بہ صفت: کڑوائی (=کڑواہٹ) (س ر)، کڑواس (کڑواہٹ) (دہ)، نرمائی (=نرمی) (پہ ب)

(۳) فعل سے مرکب: چلنت (س ر)، پُسرائ (پُسرنا سے) (دہ)

(۴) یائے زائدہ کے ساتھ: خوشبوئی (س ر)

(ب) اسم ظرف: دھپ کالا (موسم گرما) (ک م ق ق)، تھنڈ کالا (دہ)۔

جنس:

(۱) بعض اسم جو موجودہ اردو میں مونث ہیں دکنی اردو میں مذکر لکھے گئے ہیں

ندا (ت ف)، دعا (ک م ق ق)، راہ (س ر) پہ ب، ہستی (ک م ق ق)، بلندی (ک م ق ق)،
مہکار (ک م ق ق)، جھلکار (ک غ)، لذت (س ر)، دولت (پ گ)، فراغت (س ر)، ضیافت
(س ر)، محبت (ک غ)، عداوت (س ر)، راحت (س ر)، عزت (س ر)، فراست (پہ ب)،
نیت (س ر)، تاب (ک م ق ق)، آس (ک م ق ق)، جان (س ر): قدماء تک یہ مذکر رہا ہے،
عمر (ک غ)، آواز (پہ ب)، بو (پہ ب)، عید (ک م ق ق)، مدد (ک غ)، حمد (پہ ب)، داد
(ک ب)، چھاؤں (پہ ب)، بھوں (ک غ)، تعبیر (پہ ب)، تدبیر (پہ ب)، تحریر (پہ ب)،
تعریف (پہ ب)، حدیث (س ر)، نماز (س ر)، شرط (س ر)، بات (س ر)، تاثیر (پہ ب)،
درگاہ (س ر)، عید گاہ (ک غ)، تخت گاہ (ک غ)، بزم گاہ (ک غ)، خواہش (ک غ)، تابش
(دہ)، مجلس (ک م ق ق)، مسجد (دہ) ہوس (س ر)،

(۲) بعض معروف اسماء دکنی اردو میں مذکر، مونث دونوں طرح استعمال کئے گئے ہیں، اکثر ایک ہی شاعر نے دونوں طرح باندھا ہے۔

غزل: (مذکر) ع غواصی صاف باتاں سوں سراسر یو غزل تیرا (ک غ) (مونث) ع جو میں غواصی

مٹھی یو غزل کھیا سو سن (ک غ)

خنجر: (مذکر) ع ستم کا گر ننگا خنجر جو ہوگا (پہ ب)

(مونث ع تیری خنجر جو ہے ووجہل جہلائی (پہ ب)

(۳) بعض اسماء جو موجود اردو میں مذکر ہیں دکنی اردو میں مونث ملتے ہیں :

مقصود (س ر)، ذکر (س ر)، ادب (س ر) ناؤں (= نام، س ر)، خواب (س ر)

تعداد :

(۱) اردو میں ایسے واحد مذکر اسماء جن کے آخر میں "الف" یا "ہ" نہ ہوں ان کی واحد جمع دونوں میں یکساں صورت رہتی ہے۔ اس کے برخلاف دکنی اردو میں ان کی جمع (ا۔اں) سے بنائی جاتی ہے جمع کا یہ قاعدہ فارسی اور پنجابی میں بھی مستعمل ہے لیکن دکنی اردو نے (ا۔اں) کی جمع کا قاعدہ ہریانوی سے لیا ہے جو نواح دہلی کی ایک بولی ہے۔ نظامی تانصرتی، (ہر چند جمع بنانے کے دوسرے قاعدے کھڑی بولی کا (و۔وں) اور برج بہاشا کا (ن۔ن) بھی دکنی اردو میں ملتے ہیں) جمع بنانے کا یہ قاعدہ دکنی اردو کی صرفی سطح پر سب سے بڑی شناخت ہے۔ اس قاعدے کا اطلاق عربی الاصل اور ہندی نژاد دونوں قسم کے اسماء پر ہوتا ہے۔

چیلان (ک پ) ہاتان (ن ہ)۔ لاچان (ن ہ)

عابداں (ک م ق ق)۔ مالیاں (ک م ق ق) خیالاں (ک م ق ق)

عورتاں (س ر)، ہاتان (پہ ب) (س ر)۔ دلاں (س ر)

آنکھیاں (س ر) موتیاں (س ر)، کتاباں (س ر)، لوگاں (س ر)

(۲) (ا۔ان) کی جمع کے علاوہ خال خال دکنی اردو میں برج بہاشا کی (ن۔ن) سے مرکب جمع بھی ملتی ہے۔

ع ہاتن کھانڈے ترکش باند (ن ہ، شعر ۹۱۷)

ع پھولن باڑی کمھلائی (شعر ۳۰۸)

ع ہاتن کھویا گھر کی جوئے (ن ہ، شعر ۴۸)

ع دوکھن سیٹی بان بکھر (شعر ۳۰۷)

ع ہاتن مانک کھویا واہ (ن ہ، شعر ۴۶)

(دکنی اردو میں (ن۔ن) سے مرکب جمع کا استعمال بہت کم ہوا ہے اور وہ بھی برج بہاشا کے زیر اثر صرف

مخصوص الفاظ کے لیے۔ یہ جمع نوسر پار میں کثرت سے ملتی ہے)

(۳) جدید اردو کی (و۔وں) کی جمع جس کا سرچشمہ کھڑی بولی ہے، دکنی اردو میں بہت کم ملتی ہے۔ مثال :

ع کھلے تھے پھول جھاڑوں پر ہراک ٹھار (پہ ب، ص ۳۸)

اسمائے ضمیر :

(۱) ضمائر متکلم

فاعلی حالت: میں، ہوں، آپ
ہم، ہمن، ہمنا، ہمے، ہمیں
مفعولی حالت: مجھے، مج، منجے، منج، منج کوں، مجہ
ہمنا، ہمنا کوں
اضافی حالت: مو، مج، مجھ، منج، میرا
ہمن، ہمارا
ہوں (=میں) ع نہ نایک ڈروں ہوں نہ پائیک ڈروں (ک پ، شعر ۸۶) ع پیارے نہ کرکھینچ ہوں تو پہ واری (ک م ق ق، ص ۶۲، حصہ سوم) (محمد قلی قطب شاہ کے وقت تک برج کا "ہوں" صرف ریختیوں کی زبان میں رہ گیا تھا۔ یوں بھی اس کا استعمال، میں، مقابلے میں بہت کم رہا ہے)
آپے: "جو نماز کوں جائے تو یو جاننا کہ آپے خدا کے حضور میں جاتا ہوں" (س ر)
ہمن (ہمارا) (ک پ) ہمن (ہم) (پہ ب) ہمنا (=ہم) "ہمنا تمنا میں کیا جدائی ہے" (س ر) ہمیں
(=ہم) ہمیں تم مل کر جائیں گے " (س ر) منجے (ک غ) مجہ (پہ ب) ہمنا (ک م ق ق)، ہمنا (س ر)
مو (=میرا) (ک م ق ق) مج (میرا) (پہ ب) منج (میرا) (ک م ق ق) ہمن (ہمارا) (ک م ق ق)

(۲) ضمائر مخاطب

واحد جمع
فاعلی حالت: تو، توں، تیں، تم، تمن، تمنا، تمہیں
مفعولی حالت: تج، تجے، تمن، تمہیں، تمنا کوں
اضافی حالت: تو، تج، توج، تجھ، تیرا، تمن، تمنا، تمارا
توں (=تو، ن ہ)، تمن (=تمہارے، ک پ، ک م ق ق) تمن (=تم، ک م ق ق)، تم (تمہاری، ک م ق ق)
ق (تجھے، ک م ق ق)، تج (تیری، گ، ع) تمننا کوں (دہ)، تمننا (=تمہارا، دہ)، تمننا (=تم، "ہمنا تمننا میں کیا جدائی ہے" (س ر) تو (=تیری، ک م ق ق) تیں (=تو، ک پ، ع رتن تمہیں ادھک تیں کیا مکہ بچن)

(۳) ضمیر غائب

واحد جمع
فاعلی حالت: وہ، وو، و، او، اُنے، اُن، انو، وے
مفعولی حالت: اُس، اُس کوں، ا سے، انوں کوں، اینوں کوں

اضافی حالت : اس کا
 او (=وہ، ک ب) اُنے (=وہ، س ر) اُنے سب جابینا "دہ" دے (وہ کی جمع، دہ) اُن (وہ جمع، ک ب)
 انو (=وہ جمع، س ر) غیب کے پردے انوں کیوں کھولتے "
 اُس (=وہ ک م ق ق)، انوکا (=اُن کا، س ر)
 انوں کوں (=اُن کو، س ر) دِن کی (=اُن کی، ک م ق ق)
 اَپن (=اپنا، ک م ق ق) اَپس (=اپنا، گ ع)
 اِپے (=آپ ہی، ک ع) (پہ ب)

(۴) ضمیر موصول

واحد	جمع	
فاعلی حالت:	جو، جے، جن نے، جنے	جن، جنو، جنوں
مفعولی حالت:	جسے، جس کوں	جنوں کوں، جنو کوں
اضافی حالت:	جس کا	جنوں کا

جے = جو ع کہ جے بولنا ہوئے نہ بول وو (ک پ، شعر ۸۶)
 ع جے تو کیتی پھریہ بات (ن ہ، شعر ۳۹)
 ع جے کچھ منگوں تج پاس تھے سو ہے سو منج کوں توں دیا (ک م ق ق) (جو، جن، جنے کے مقابلے میں اس استعمال کم تر ہے)
 جنے (=جو) (ک م ق ق) (س ر) "جنے سینا اُسے گھائل ہونا ہے"
 جن (=جو) (ک م ق ق)
 جنو (=جمع جو) "اس کے فرمائے پر جنو چلے" (س ر- ص ۱۶)
 (موجودہ اردو میں "جو" فاعلی حالت میں واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دکنی اردو میں واحد جو، جے جن، جنے ہوتا ہے جمع کے لیے جنو اور جنوں آتا تھا)

(۵) ضمیر استفہام

واحد	جمع	
فاعلی حالت:	کون، کِن، کِنے، کو	کِن
مفعولی حالت:	کس، کس کوں، کسے، کس نے	کِنے کوں
اضافی حالت:	کس کا	کِن کا

- (ک غ) کین (=کون) ع بخانوں لے قلم کین خوش نویس آج
 (پھ ب) کینے (=کون) ع کینے بے رحم باندیا تچ پلو آگ
 (ک ش) کو (=کون) ع یاقوت ہوا مرجاں میں کو پے رتن برتر کہو

(۶) ضمیر اشارہ

ضمیر اشارہ قریب

- (۱) یو (=یہ) "لہوے تے یو تخت و تاج آیا" (س ر)
 (۲) اے (=یہ) ع گیا آواز سو آسمان میں اے (پھ ب۔ ص ۱۳۴)
 (۳) ایہ (=یہ) ع ہرا کر ڈگرایہ کدم رائے آئے (ک پ۔ شعر ۱۰۸)
 (۴) یے (یہ جمع) ع یے رقیباں دیکھ کر دکھ تھے کیے، آپ جیو پر خست
 (۵) ان (=اس) "ان آب حیات نے اُس آب حیات کا رکھیا لاج" (س ر)
 (۶) انے (اس نے) "انے پکڑیا تھا خاموشی" (س ر)
 (۷) انوں (ان کو) "انوں کو کاں کا آرام" (س ر)

ضمیر اشارہ بعید

- وو (وہ) "وہ ہمیشہ کھڑا" (س ر)
 اُن کے (اُن کے) (ک م ق ق)
 اُنوں کوں (=اُن کو) (س ر)

(۷) ضمیر تنکر

فاعلی حالت: کوئی، گئی، گچ، کوچ

مفعولی حالت: کسی کوں، کن کوں

اضافی حالت: کسی کا، کسی کے

- گئی (=کوئی) ع جو گئی ہے باغباں اس پھول بن کا (پھ ب) (اس کا عام املا "جکئی" تھا)
 گچ (=کچھ) ع نہ آوے گنج قاروں کام کچ تچ حسن کا گنج ہے (ک م ق ق) (اس کا املا کوچ بھی ملتا ہے)

جیکو (جو کوئی) ع جیکو چڑے گھوڑے اُپر اس کوں سواراں میں گین (ک م ق)

(جو کوئی اور جیکوئی بھی ان معنوں میں مستعمل تھا)

فعل:

(۱) اردو میں علامت مصدر "نا"۔ دکنی اردو میں اسکی انفی شکل (ناں) بھی ملتی ہے :

ع سو بولیا تجھے جو نہ تھا بولناں (ک پ، شعر ۱۲۶)

کھولناں (ک پ، شعر ۱۲۶)، کرناں (ک پ، شعر ۵۰۷)

برج بھاشا کی علامت مصدر (ن - ن) سے مرکب افعال بھی مل جاتے ہیں۔ نو سرپار میں اس کی مثالیں

کثرت سے پائی جاتی ہیں :

ع نہ مر جاؤ توں چھوڑا وگن کرن (ک پ، شعر ۵۹۶)

ع ڈھونڈن لاگے کدھرے ٹھار (ن ۵، شعر ۵۶۷)

ع رہن لاگے خوشی سات (ن ۵، شعر ۵۹۰)

ع اوٹن لاگا کس کس دھات (ن ۵، شعر ۶۱۲)

ع برہ کی گرہ دل تے کھولن لگی (گ ع-ص ۲۶۱)

یہ مصدر (و) کے اضافے سے بھی بنایا جاتا تھا۔

پڑھاؤن (= پڑھانا) (ک-پ، شعر ۵۸۵)

جاؤنا (= جانا) ع نہیں ہے حاجت اے جاؤنے کوتاہ حجاز (ک م ق ق)

آؤنا (ک ب، ص ۱۶۲)

پیونا (ک ب، ص ۱۶۲)

(۱) دکنی اردو کے فعل ناقص موجودہ اردو سے خاصے مختلف ہیں۔ یہ عموماً اس شکل میں آتے ہیں : ہے، اہے

، ہیں، ایس، اتھا، اتھی، اتھی، اتھی، اتھے، اتھیاں، اتھیاں

اہے (ہے) : ع جہاں جکچہ ہے وہاں سب اہے ظہور اُس کا (س ر)

اہیں (ہیں) : ع جکوئی تج محبت کے ماتے اہیں (گ ع)

اتھا (تھا) : ع اتھا دل صاف تس کا جو کہ درپن (پہ ب)

ع اتھا تو نیچ اول ہور آخر تہینچ (گ ع)

اتھی (تھی) ع نہ بیٹا ا سے ایک بیٹی اتھی (چ م)

اتھے (= تھے) : ع گھڑی یک یکس نہ رہتے اتھے (گ ع)

تھیاں (= تھیں) : "جوباتاں خدا کوں بھاتیاں تھیاں"

سوباتاں دلیچ میں تے آیتاں تھیاں (س ر)

ع انو کے کنے بھی اسی دھات تھیاں (گ ع)

اتھیاں (= تھیں): عاتھیاں خوبصورت چھبیلیاں جتیاں (چ م)
 (۲) دکنی اردو میں ماضی مطلق کے لیے علامت مصدر، نا، گرانے کے بعد زیادہ تر "یا" لگایا جاتا ہے، جو ہر
 یانوی کی بھی تخصیص ہے، دکنی اردو کی یہ مسلسل خصوصیت رہی ہے:
 اٹھیا (= اٹھا) ع گیا راجہ تہ جب اٹھیا بول یہ (ک پ)
 رہیا (ک پ، ص ۱۱۵)، کہیا (ک پ) رکھیا (س ر)، دیکھیا (س ر)
 "لشکر اپنا سب دیکھیا، لشکر کی گنتی ہمت کریا (س ر)
 شاذ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کلاسیکی دکنی اردو میں بھی "ا" کا ماضی مطلق مل جاتا ہے۔ جیسے "
 قامت جو نظر کو رقیب کے سنگات دیکھا (س ر)
 ع چھپا سیمرغ جا کوہ قاف میا نے (پہ ب۔ ص ۶۸)
 بعض اوقات علامت مصدر گرانے کے بعد اگر خاتمے پر مصوٰۃ رہ جائے تو "ء ی" کا اضافہ کیا جاتا ہے
 ع مبارک باد دینے آٹیا نوروز تج دوبار (ک م ق ق)
 (۳) دکنی اردو میں ایک فعل "کتیا" بھی نظامی تانصری مسلسل استعمال ہوتا آیا ہے بلکہ یہ شمالی ہند کی قدیم
 اردو تک میں رائج تھا۔ فعل کی یہ شکل کبھی ماضی مطلق کے لیے استعمال ہوتی تھی اور کبھی حال مطلق کے لیے۔
 کیتا (= کیا) ع سو کیتا ابتدا تعظیم کا سطر (پہ ب)
 کیتا (= کرتا ہے) ع معطر اس سوں کیتا ہے چمن کوں (پہ ب)

(۴) ماضی احتمالی

دکنی اردو میں ماضی احتمالی کے لیے ماضی مطلق کے بعد "اچھے گا" یا "اچھے گی" کا اضافہ کیا جاتا ہے
 (اچھنا = ہونا)

"تاراں کی زنجیراں سوں جکڑ کر جان گیا اچھے گا" (س ر)
 "جدہاں تے جو کوئی دنیا میں آیا اچھے گا عجب ہے جو کوئی ایسا دغا کھایا اچھے گا" (س ر)

(۵) فعل حال

معیاری اردو کے مانند دکنی اردو مصدر سے علامت "نا" حذف کرنے کے بعد "تا" لگا کر فعل حال بنایا جاتا ہے۔
 لیکن کبھی بھی برج کے زیر اثر صرف "ت" کے اضافے سے بھی بنالیا جاتا ہے:
 ع ادھر تیرے کوثر کا پیالہ پلات (ک م ق ق)
 سنات (ک م ق ق) (یہ شکیں محمد قلی قطب شاہ سے مخصوص ہیں)
 دکنی اردو میں (شمالی ہند کی قدیم اردو کی طرح) حال مطلق بنانے کا ایک قاعدہ یہ بھی رہا ہے کہ مضارع

کے بعد " ہے " یا " ہیں " بڑھا کر بنا لیتے ہیں۔ اردو میں یہ شکل بیسویں صدی تک جاری رہی ہے۔ لیکن اب متروک صرف بعض علاقوں اور طبقوں میں رائج۔ غالب نے اپنی مشہور غزل

ع کھینچتا ہوں جس قدر مجھ سے وہ کھینچتا جائے ہے میں استعمال کیا ہے۔

ع پھل بھاگ سب پہلے ہیں، دُندے سودیکھ جلے ہیں (ک م ق ق)

دکنی اردو میں حال مطلق کی کے لیے صرف مضارع کا استعمال بھی ہوا ہے۔ درحقیقت یہی حال مطلق کی قدیم شکل ہے، جو دکنی میں باقی رہ گئی ہے:

ع کرتے مزدوری اپنے بغل میں سو رکھ کتاب (ک م ق ق)

" ہوتا سب خدا کا بھاتا " (س ر)

(مضارع کی موجودہ صورت کا ارتقا اس انداز میں ہوا ہے: جاوے۔۔۔ جاوے ہے۔۔۔ جائے ہے۔۔۔ جاوت ہے۔۔۔ جات ہے۔۔۔ جاتا ہے۔۔۔ (جاوے، جاوے ہے، جائے ہے، آئے، بھی کھڑی بولی کے علاقے میں رائج میں رائج ہے۔ جاوت ہے، جات ہے برج بھاشا کی معیاری اور بول چال دونوں کی شکلیں ہیں۔ انہیں کی آمیزش سے معیاری اردو کا " جاتا ہے " بنا ہے)

مستقبل:

مستقبل بنانے کے لیے دکنی اردو میں بھی مضارع کے بعد " گا " " گی " (جمع " میں گیاں "، جو معیاری اردو میں نہیں ہے) اور " گے " کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ گیاں (جمع گی)

ترے جب کی ات سوز دھر آئیں گیاں

سلامت ترے ٹھہار اُنپر آئیں گیاں (گ ع)

مستقبل مطلق کی بناوٹ میں (س) سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ یہ دکنی اردو کی خصوصیت ہے۔ اس (س) کا تعلق سنسکرت کے زمانہ مستقبل کے (س) سے ہے۔ راجستھانی کی بعض مشرقی بولیوں میں مادّے کے ساتھ (س) لگا کر اس طرح کی شکل بناتے ہیں۔ دکنی اردو میں یہ شکلیں تسلسل کے ساتھ نظامی تا نصرتی پائی جاتی ہیں۔

متکلم	حاضر	غائب
واحد : مارسوں	مار سے، مارسے	مار سے، مارسے
جمع : x	مارسوں	مارسی
واحد متکلم مذکر: جاسوں (جاؤں گا) ع کے ہرگز نہ جاسوں تیرے کہے منے (ق م)		

واحد حاضر مذکر: سے ع جے توں کہہ سے رہیا ناگج (ارشاد نامہ)
 جمع متکلم مذکر: سی ع سبھی دؤراں نہ آسی اجی تج سم (ک م ق ق)
 واحد غائب: اس کے دیوے کوں کیوں نہ ہوسی روشنی (س ر)
 اس صیغے کے سلسلے میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

(۱) دکنی اردو میں "سی" "سے" "سوں" اور "سین" عموماً، نا، یا "نہ" (نفی) کے ساتھ آتی ہیں۔

(۲) ان علامتوں سے فعل مستقبل کے ساتھ "سکنا" فعل امدادی کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔

ع نہ ہوسی کدھیں پانچ انگل سمان (ک۔ پ)
 ع تج سار کہیں جگ میں پریزاد نہ ہو سے (ک غ)
 ع سبھی حوراں نہ آسین آج تج سم (ک م ق ق)
 "اس کتاب کوں سینے پر تے ہلاسی نا، اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلاسی نا" (س ر)
 "سخی پر کسی کی بددعا چل سی نا" (س ر)

مضارع

دکنی اردو میں مضارع (جو فعل حال کی قدیم شکل ہے) حسب ذیل بناوٹ کے ملتے ہیں:
 چلے (س ر) پاوے (س ر) جائے (پہ ب) پیوے (س ر) سووے (س ر) دیوے (س ر)

امر

امر کی جمع کی بعض قدیم شکلیں دکنی اردو میں رائج رہی ہیں۔
 لیو (پہ ب) دیو (پہ ب) گو (مصدر کنا = کہنا) امر کی ایک استثنائی شکل ہے۔
 منجے اس ٹھار کیا تدبیر ہے گو مرا اس ٹھار کیا تقصیر ہے گو (پہ ب)

فعل معطوف

وہ فعل جس کو دوسرے فعل کے ساتھ، کے، کر، کو، یا، کوں، لگاتے ہیں:
 کے:، جل کے راک ہونا، (ک غ)
 کر/کرکر: "نظر قامت سوں وداع ہوکر، تسلیم کرکر،
 سرپر ہاتھ دھر کر اپنے ٹھارتے ہلیا، چلیا" (س ر)
 کوں: ع وو حاجب جاکوں بولیاں شہ سوں اپنے (پہ ب)

متعلق فعل

متعلق فعل کی گیارہ قسمیں ہیں۔ یہاں دکنی اردو کے صرف مخصوص متعلق فعل کلمات کا ذکر۔۔ مع مثالوں کے کیا جائے گا

(۱) متعلق فعل کیفیت و حالت

ٹُک ع جوباتاں میں وہ نارٹک آئے گی (ق م)

(یہ میر تقی میر بلکہ اس کے بعد تک رائج رہا ہے)

دھات (= طرح) ع ہوئے جس دھات سوں ووغم تے آزاد (پہ ب) "ہرگز کوئی فصیح اس فصاحت

سوں بات نہیں کیا، اس دھات بات کوں سلامت نہیں دیا" (س ر)

(دکنی اردو کا مخصوص متعلق فعل)

نپٹ ع نپٹ گرچہ خدمت میں ہوئے سمجھ (گ۔ ع)

(میر تقی میر کے عہد تک رائج رہا)

جھٹ مٹ (= جھوٹ) موٹ

ع خبر چلنے کی سن جھٹ مٹ ہوا ہے تھوڑا تھوڑا جی (وہ)

سچیں مچیں (= سچ مچ) "سچیں مچیں یو فرشتہ ہے" (س ر)

ہلو (= ہولے) ع ہلو اس سنگ دل کوں نرم کرتوں (پہ ب)

("ہلوں" بھی تلفظ کیا گیا ہے)

متعلق فعل زماں

(۱) اب، اتا، اتال، اتیال، آجنوں

(۲) جب، جدان، جدھاں، جو

(۳) تب، تدهاں، تو

(۴) اوّل، پچھے، پچھیں، پیچھیں

(۵) تُرت، بیگی، بیگ

(۶) جَم، ہمیشہ، سدا

(۷) آج، کل، پرسوں

(۸) کدھیں، کد

اتا (= اب) ع اتا میں چپ رہنے کی نئی مراٹھ ہاتھ چھوڑو خوں (وہ)
 اتال (= اب) ع اتال تاب نئی مُنچ انتظار کوں جی (ک غ)
 جدھاں (= جب تک) ع جدھاں لگ مہرو چرخِ اختری ہے (پہ ب)
 جو (جب تک) جَوَلگ جنوب و مشرق و مغرب ہے ہور شمال (ک غ)
 آجنوں: (اب تک) "انو آجنوں بی جیتیاں ہیں" (س ر)
 تدھاں (تب سے)

ترے ملنے کا مئے پی کر ہوا ہوں مست میں جب تھے
 تدھاں تے مئے کی سوگند کھا، تجا ہوں گھر کلا لاس کا (وہ)
 پچھیں (= پیچھے) ع کتک دن کے پچھیں امید کا سور (پہ ب)
 تُرت (ترنت، فوراً)
 ع ہو عارف تُرت کر لے حاصل اس مطلب ضروری کوں (ک غ)
 بیگ (= جلدی) ع وہیں بیگ خالانے چھاتی لگا (گ ع)
 جم (= ہمیشہ) ع جم گزگڑاوں مست ہو پتی مدن کی ڈھال رے (ک غ)
 پرسوں (کل کے بعد کا دن)

ع صبا پرسوں لگوں چنچل تمہارے ہات آتی ہے (وہ)
 (موجودہ دکنی بول چال میں پرسوں کے معنی کچھ دن پہلے بھی ہوتے ہیں۔ ان معنوں میں کلاسیکی
 دکنی کی کوئی مثال ہمیں نہیں مل سکی۔ شمالی ہند کے لوگ اکثر اس مفہوم سے دھوکا کھا جاتے ہیں)
 کدھیں (= کبھی) ع کدھیں بے خبر ہوئے کدھیں ہوئے ہوشیار (ق م)
 "انوکا بول کدھیں ہو آتا کدھیں نہیں ہو آتا" (س ر)
 متعلق فعل مکان

- (۱) یہاں، یاں، وہاں، واں
- (۲) جہاں، جاں، کہاں، کاں
- (۳) ادھر، اُدھر، وودھر، کدھر
- (۴) اگے، آنکے، انگے، انگیں، آگل، اگل
- (۵) بہیتر، بہتر، بہترال، باہر، بہار
- (۶) اوپر، اُپر، اُپرال، آپار

- (۷) تلے، تلیں، تلار، تلہار
 (۸) نزدیک، نزک، پیلار، ایلار
 جاں / واں (= جہاں، وہاں)
 "جاں رہے کھڑے واں قبول پڑے" (س ر)
 وودھر (= ادھر) ع گھڑی کوں دل گھڑی کوں جیو یو دونوں کھینچے وودھر (ک ع)
 اگے (= آگے) (پھ ب)
 آنکے (آگے) (ک غ)
 آگل (= آگے) ع جس کے آگل کسی کوں منصب نیں (ک پ)
 اگل (= آگے) (گ ع)
 بہار (= باہر) "ا سے نہ بہتر قرار نہ بہار" (س ر)
 بہترال (اندر، بہترال کرزر کا پلو کی چپ کٹاریاں کھاڑتی
 (دہ)
 اُپرال (= اوپر) ع جو بیٹھا تخت کے اپرال آکر (پھ ب)
 تلیں (ک غ)
 تلار (= تلے، نیچے) ع رات اندھیاری چھپی جا کے زمیں کے تلار (ک غ)
 تلہار (= تلے) (گ ع)
 نزیک (= نزدیک) (دہ)، نزک (ک غ)
 پیلاڑ (= پرے) "یو عقل نے پیلاڑ ہے آدمی سمجھتا کیوں" (س ر)
 ایلاڑ (= ادھر) "چوڑی ایلاڑ ہے" (س ر)

متعلق فعل استفہام

- دکنی اردو حسب ذیل الفاظ اس کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔
 کیوں، کی، کئے، کیا، کا ہے، کا ہے کوں، کائیکوں، کس دھات، کیوں کر
 کی (= کیوں) ع آنگن میں کی کھڑے ہیں جیوں شمع پر پتنگ ہو
 (دہ)

- کے (= کیوں) ع مونین میا نے بیس کے بھی کئے نہ آوتے (ک م ق ق)
 کائیکوں (= کا ہے کوں کا مخفف) ع ہمیشہ کائیکوں اٹتی ہے یوں خاک (پھ ب)

متعلق فعل سبب و علت

جس دھات، اس دھات، اس بدل، کیا واسطہ کہ، مخصوص دکنی اردو کے ہیں
 اس بدل (= اس وجہ سے) "اس بدل کہتے ہیں کہ پیر کی بندگی کرو" (میراں جی خدانما)
 کیا واسطے کہ (= اس لیے کہ) "ان دونوں کوں شہر دیدار کے نزدیک لیا نا کیا واسطے کہ لشکر پور حشم
 آتا ہے" (س ر)
 متعلق فعل مقدار

ایتا، بتا، جتا، جیتا، بھوت
 یتا (= اتنا) (ق م)
 جتا (= جتنا) (پہ ب)
 بھوت (= بہت) ع تمہارے ملنے کی دل میں کلولی بھوت آتی ہے (وہ) (یہ تلفظ قدیم اردو اور موجودہ
 بول چال کی زبان میں عام ہے)
 متعلق فعل ایجاب و انکار
 ہاں، ہو، نا

ہو (= ہاں) "ہو تو بی کتا ہے سواس میں ایک مانا ہے" (س ر)
 (دکنی اردو میں، ہاں، بھی ملتا ہے لیکن "ہو" اس سے مخصوص ہے جو تا حال دکن میں رائج ہے۔ لطف یہ ہے
 کہ اس کے ساتھ گردن کی جنبش نفی کے انداز میں کی جاتی ہے جو اکثر شمالی ہند والوں کے لیے غلط فہمی کا باعث
 بن جاتی ہے)
 مرکب متعلق فعل

جب دو کلمے ایک ساتھ کسی فعل کی وضاحت کے لیے لائے جائیں۔ دکنی اردو کے خاص مرکب متعلق فعل حسبِ
 ذیل ہیں

(۱) کیئں کا کیئں، کاں کاں، آس پا سے۔

(۲) جاں، لگوں، اجھوں لگ، جَو لگ، تَو لگ، جدھاں لگ، تدھاں لگ

(۳) جُلگ، تُلگ، جَو لگن، تَو لگن، گو تلک، تو تلک

آس پا سے (= آس پاس) ع کہ جیوں چاند کے آس پا سے نجوم (گ ع)

جاں لگوں (= جہاں تک) ع ساتی گئے ہیں جاں لگوں وہاں لگ تو جانا ہوئیگا

(دہ) جُلگ / تُلگ (= جب تک / تب تک)

جلگ دور عالم کا باقی اچھے

تلگ یاد یوزم ساقی اچھے (گ ع)

جَوَلگن / تَوَلگن (= جب تک / تب تک)

"جَوَلگن دینا تولگن اسے حیات (س ر)

کو تلک (= کب تک) ع اچھوں میں کو تلک روتی بلکتی (پہ ب)

الفاظ کی تکرار

دکنی اردو میں اس سلسلے میں اکثر ایک درمیانی "ے" کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ رگے رگ (= رگ رگ) (پنج

گنج : جانم)، گھرے گھر (ک غ) جنگلے جنگل (ک غ) بنے بن (ک غ)، راتے رات (پہ ب) ہاتے ہات (گ ع) تکرار لے لیے اکثر "ں" کا بھی درمیان میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

ٹھاریں ٹھار (س ر)، بالیں بال "آدمی کو پریشانی ہے۔ بالیں بال" (س ر)۔

ٹھاویں ٹھاویں (س ر)

کبھی کبھی تکرار کے لیے دو لفظوں کے درمیان "الف" بھی لایا جاتا ہے۔

ع رنگا رنگے پھولاں کی ہے ہر چمن کو آج فرح (ک غ)

حرف

حرف ربط

علامتِ اضافت : دکنی اردو میں کا - کی - کے علاوہ کیرا، کیری اور کیرے بھی بطور علامتِ اضافت رہے

ہیں۔ ان کا استعمال مثنوی کدم راؤ پدم راؤ اور نو سر پر جیسی قدیم تصانیف میں ملتا ہے۔ لیکن وجہی نے سب رس میں کا - کی - کے - ہی استعمال کئے ہیں۔ اس کا گاہے گاہے استعمال نصرتی کے زمانے تک رہا ہے۔

ع مچھندر کیرا پوت اکھور ناتھ (ک - پ - شعر ۳۶۶)

ع آنکھیں کیرا کا جل پونچھ (ن - ہ - شعر ۱۱۴۱)

ع کہ کجلی بن اُس بن کیرا ناٹو ہے (گ غ - ص ۱۴۲)

کیرے (گ ع)، کرا (= کیرا) (پہ ب)

ان حروف کے استعمال کا قاعدہ یہ ہے کہ جب مضاف واحد ہوتا ہے تو "کا" یا کیرا لاتے ہیں۔ جمع مذکر

میں "کے" یا "کیرے" اور واحد مونث یا جمع مونث میں "کیری" لاتے ہیں، مضاف اگر جمع مونث ہو تو

حرف اضافت "کی" کی جمع "کیاں" بنائی جاتی ہے
کیاں (=کی جمع مونث) ع پیاریاں شاہ کیاں مل عید کاسنگار کیتاں ہیں (ک م ق ق)

علامت فاعل

علامت فاعل "نے" ہے۔ لیکن یہ علامت ہر زمانے اور فاعل کے ساتھ استعمال نہیں ہوتی۔ اس کے استعمال کے چند قاعدے ہیں۔ عام طر پر یہ ماضی مطلق، ماضی بعید و قریب اور فعل لازم و متعدی کے ساتھ استعمال کی گئی ہے۔ سب رس میں ماضی استمراری کے ساتھ یہ علامت کبھی نہیں آتی۔

حرف "نے" کا استعمال کدم راؤ پدم راؤ میں مطلق نہیں ملتا۔

(۱) ماضی مطلق کے ساتھ "نے" کا استعمال

"وہی بولیا جو خدا نے فرمایا" (س ر)

(۲) ماضی قریب کے ساتھ، "نے" کا استعمال

"خدا کے دوستاں نے بولے ہیں" (س ر)

(۳) ماضی بعید کے ساتھ، "نے" کا استعمال

"ہمت نے مکتوب لکھا تھا" (س ر)

(۴) دکنی اردو میں، "نے"، فعل متعدی اور فعل لازم دونوں کے ساتھ استعمال ہوتی ہے

فعل متعدی: ع کیا صبح نے جھل سوں دامن کوں چاک (گ ع)

فعل لازم: "رقیب نے روسیہ نے بے نصیب نے بولیا" (س ر)

(۵) دکنی اردو میں، "نے"، کا استعمال فعل جنس اور تعداد میں فاعل کے تابع ہوتا ہے۔

بلحاظ جنس: زہرہ نے جلوہ گائی (س ر)

خضر نے بی انکھیاں سوں وونچ اشارات دکھلایا (س ر)

بلحاظ تعداد نازاں نے گھونگٹ کھولے (س ر)

دکنی اردو میں ماضی مطلق، ماضی قریب اور ماضی بعید کے ساتھ 'نے' کا استعمال ضروری نہیں ہے یہ

اکثر حذف بھی کر دیا جاتا ہے۔

ماضی مطلق: ع راجناکل جو خواب دیکھی میں (ک غ)

ماضی قریب: ع سکھی توں کجلٹا پن سب سٹی ہے (ک ب)

ماضی بعید: ع وو ایسے وقت شہ مجلس کیا تھا (پہ ب)

علامتِ مفعول

دکنی اردو میں علامتِ مفعول یہ ہیں: کو، کون، تئیں۔

(۱) مفعول ذی عقل یا جاندار ہو تو، کون، یا 'تئیں' علامتِ مفعول استعمال ہوتی ہے۔

'دل کوں صاف کرو، بہت نکو لاف کرو' (س ر)

ع خدا تئیں جا کہہ توں تو بھی کہ اس عالم کی جیوتی کوں (ک غ)

(تئیں کا استعمال شمالی ہند میں انیسویں صدی تک رہا ہے اب دہلی اور اس کے اطراف میں صرف بول

چال میں رہ گیا ہے۔ تحریر میں متردک ہے)

(۲) اردو میں مفعول ذی عقل یا بے جان ہو، تو علامتِ مفعول استعمال نہیں ہوتی لیکن دکنی اردو میں ایسی

صورت میں بھی اکثر باریہ علامتِ مفعول کے طور پر لائی جاتی ہے۔

سناراں اس انگشتی کو ایسے وقت میں گھڑے (س ر)

ع وہاں تے آیتہ الکرسی کوں پڑکر (پہ ب)

ع چھپی سوبات کوں اس سوں اٹھی بول (پہ ب)

(۳) بعض اوقات علامتِ مفعول محذوف بھی ہوتی ہے

ع خدا آپ صنع تے دیتا ہے تم ناز (ک م ق ق)

(۴) دکنی اردو میں 'نے' بھی علامتِ مفعول کے طور پر استعمال ہوتی ہے جیسے:

'نفر ہزار ہزار ہو تو بی صاحب نے اپنا داب رکھتا' (س ر)

(یہ خصوصیت ہریانوی میں آج بھی عام ہے۔ جیسے: من نے صاحب نے ماریا = مجھ کو صاحب نے مارا)

حروفِ جار

(۱) میں، منے، منیں، بہتر

(۲) سے، سوں، سو، سیتی، سیتیں، سینتھیں، تھیں، تیں، ستے، سیٹھے، تھے، تے۔

(۳) تلگ، لگ، لگوں، لگن

(۴) پر، اُپر، اوپر، اُپرال، پو، پ

(۵) کدن، کدھن، سنگات،

(۶) تائیں، کنے

منے: ع توں جامع فضائل منے سب ہوا (گ ع)

منیں : ع پکڑ غصے سنی دانتاں منیں لب (پہ ب)
 بہتر : (ک - م - ق - ق) 'سوں : (س ر)
 سیتی : ع الہی غیب کے پردے سیتی توں (پہ ب)
 سیتی : ع گل مصطفیٰ سیتی سیرا گندھا کر (ک م ق ق)
 تہیں : ع ہمارا درد تمن دوری تہیں ہے گاڑا سخت (ک م ق ق)
 تیں : ع زمیں تیں نیشکر جب بہار آیا (پہ ب)
 ستیہے : ع ہوا پرگٹ جدھاں ستیہے دینا ہور دین قدرت سوں (ک م ق ق)
 تھے : (ک - م - ق - ق) 'تے (س ر)
 لگ : (= تک) (س ر)
 تلگ : (ک - م - ق - ق) 'لگ (گ ع) 'لگوں (دہ) لگن (س ر)
 اُپرال (= اوپر) ع جو ب ٹھاتخت کے اُپرال آکر (پہ ب)
 پو (= پ) "موں پو مسجد دل میں بت خانہ" (س ر)
 کدن (= طرف) (د - ہ) کدھن (پہ ب) (س ر)
 نزک (= نزدیک) (گ ع) تائیں (= واسطے)
 تیرے تائیں ہوئی ہے یو بدنام یاں (وم)
 سنگات (س ر)

حروفِ عطف

(۱) اور، ہور، د، کیا
 ہور (اور) ع تو نچہ ان کا ماہور باپ (ن ۵، شعر ۲۳۵)
 ع دین ہور دینا اُنن اسلام تھے پایا رواج (ک م ق ق)
 "خیال ہور نظر" (س ر)
 و (اور: واؤ عطف فارسی)
 دکنی اردو میں یہ دو ہندی الفاظ اور ایک ہندی ایک فارسی کے درمیان بھی آتا ہے۔
 "خدا میں واس کی قدرت میں" (ک ح ص ۲۶) "مرنا و جیونا" (ک ح)
 گن و گیان (ک م ق ق)

(یہ رجحان دہلی کے متقدمین شعرائے اردو تک میں رہا ہے)
کیا: "کیا عورت کیا مرد جس میں ہے کچھ عشق کا درد" (ر)

حروفِ استدراک

ولے، پَن، اَمّا، مگر، گرچہ، بلکہ، پَن (= پر) "بات جدا پَن بھید وہیچ (س ر)
(دیگر جدید اردو سے اشتراک رکھتے ہیں)

حروفِ استثنا ء

بِن، بِنّا، باج، بغیر، بغر، بجز
بِنّا (= بِن، بغیر) ع قلیہ برنجی خاکینہ کیوں کھاؤں میں ساتی بِنّا (دہ)
باج (= بغیر) ع پیاباج پیالہ پیا جائے نہ (ک م ق ق)

حروفِ تخصیص

ہر، بھی، بی، تو، ہی، - "چ"
ہر ایکس (ہر ایک) "ہر ایکس پاس کون منگ لیتا (س ر)
(ہر کے ساتھ ایکس کا استعمال صرف اشخاص کے لیے مخصوص ہے۔ بے جان اشیاء کے استعمال نہیں ہوتا)
تو: ع تو نا کہے تو کون کہے عندلیب (ک غ)
چ: (تاکیدی یا تخصیصی)

"نکو" کی مانند دکنی اردو کے لیے کلیدی حرف کا حکم رکھتی ہے۔ یہ علامت مراٹھی سے مستعار لی گئی ہے۔
گجراتی میں یہ "ج" کی شکل میں آتی ہے۔ شمالی ہند کی اردو میں یہ معدوم ہے بجز اسمعیل امروہوی کے۔ اس
سلسلے میں یہ بتادینا ضروری ہے کہ اسمعیل نے عالمگیر کے لشکر کی حیثیت سے اپنی زندگی کے بیس پچیس سال
نواح اورنگ آباد میں گزارے تھے۔ تاہم "چ" تخصیصی کا استعمال اسمعیل نے بھی شاذ کیا ہے۔

وہی آب ابریق موں تھا تمام

کہ تھا آب کوثر اسی کا چ نام

ورنہ قدیم و جدید دکنی اردو میں یہ تخصیصی حرف اسم، فعل اور حرف ہر ایک کے ساتھ مرکب آتا
ہے اور کثرت سے استعمال ہوتا آیا ہے نظامی نے بھی اپنی مثنوی کے دوشعروں میں استعمال کیا ہے۔

ع نہ بھاوے مجھے وہ جو میرا چ باپ (ک۔ پ۔ شعر ۲۲۸)
ع اکا یک کہیا تو بچہ میرا چ سیکھ (ک۔ پ۔ شعر ۵۵۴)

مزید مثالیں

ع تو بچہ ان کا ماہور باپ (ن۔ ہ۔ شعر ۲۳)
"وے حیران ہوئیں گے کہہ ناسکین گے کہ یونچہ ہے یا ایسا چ ہے" (س ر)
ع جدھر دیکھوں تو فریاد آج سب تیرا چ ہوتا ہے (گ ع)
ع سوویسا چ تس پر پڑے آسبب (گ ع)
(سنسکرت میں اسکا مآخذ "چ ایو" ہے)

حروف تشبیہ و مثال

ناد، سار، نممن، نممنے، مانند، جانو
ناد : ع فلک کے ناد کس جا گئے پہ ناٹھار (پہ ب)
نممن : ع کیا دکھ سودندیاں نممن جگ تے بہار (گ ع)
نممنے : ع رگے رگ وہ خوش روح نممنے سرس (گ ع)
"کر" کا مخصوص استعمال
دکنی اردو میں، کہہ کر، کا مخفف، ککر، استعمال کرتے تھے۔ یہ علامت معطوف کے علاوہ (جیسے، پہاڑ کر، ککو
(کہہ کر = ککر) کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔
ع نکو جانو جھاڑاں کوہیں جھاڑ کر (ق م)
ع ساقی ہمارے گئے وہاں جو ملک ہے ملبار کر (دہ)
یعنی "ککر" = کہہ کر
اسی طرح موجودہ دکنی کا ایک عام کلمہ، بول کر، ہے جو کہہ کر (= ککر) ہی کے معنوں میں مستعمل
ہے۔

"شراب تو خوب ہے ولے ستمی اُسے بُرا بول کر ڈراتے" (س ر)

نحوی خصوصیات

دکنی اردو کی نحوی خصوصیات جاننے کے لیے ہمارے پاس نثر کے کافی نمونے نہیں ہیں۔ چوں کہ دوسری زبانوں کے مانند دکنی اردو کا قدیم ادب منظوم ہے اس لئے جملوں کی بناوٹ کا صحیح علم حاصل نہیں ہوتا۔ پھر قدیم نثر پر عربی فارسی کی نحوی ساخت کی خاصی چھاپ رہی ہے۔ نثر کے قدیم رسالوں میں سے اکثر فارسی عربی سے ترجمہ ہیں یا تلخیص ہیں اس لیے ان کے مصنفین کا اصل عبارت سے متاثر ہو جانا ضروری ہے۔ دکنی اردو نثر کا سب سے اعلیٰ اور جامع نمونہ ہمیں وجہی کی سب رس میں ملتا ہے لیکن مرصع و مقفیٰ نثر ہونے کی وجہ سے اس میں دکنی کی نحوی ساخت چھپ جاتی ہے۔ عربی فارسی نحو کے اثرات اس قسم کے جملوں سے ظاہر ہیں۔

(۱) ایسا اس تن میں جاں تو سب چیزاں پر دوکھ سوکھ، مرنا و جیونا (ک ح ۳۴)

(۲) سوال، او کہاں تھا کہیں تو تعلقات جاگا سوں دھرتا تھا بھی؟ (ک ح ۲۲)

(۳) خدا کہا نماز کے نزدیک نکو ہو مستی کے حال میں (معراج العاشقین)

(۴) انوں بی نماز کرتے اپنے اپنے (معراج العاشقین)

اس دور میں جملے کے نصف اول میں صفت کی صورت میں جملے کے جز کو استعمال کرنے کا میلان بھی نظر آتا ہے۔

"جسے کپڑے سو اس کی آستین میں پیکے تھے" (شکارنامہ)

"ہو درود اپنے رسول پر بھیجنا اور ان کے فرزندوں پر ہو سب امت کے خاصاں پر"

(شرح مرغوب القلوب)

سولہویں صدی عیسوی سے دکنی نثر کے جملے کی بناوٹ زیادہ باقاعدہ ہونے لگی۔ آج کل کی اردو کے مطابق اس میں بھی

(۱) جملے میں فاعل پہلے، پھر مفعول اور آخر میں فعل آتا ہے۔

(۲) فعل ناقص مبتدا اور جز کے بعد آتا ہے۔

(۳) صفت موصوف سے پہلے آتی ہے۔

(۴) متعلق فعل عام طعیر فعل کے پہلے آتا ہے۔

(۵) حروف فجائیہ جملے کی ابتدا میں آتے ہیں۔

(۶) حروف تخصیص کلمے کے ساتھ آتے ہیں۔

البتہ، مطابقت، میں دکنی اردو اور جدید اردو میں کافی فرق پایا جاتا ہے۔

(۱) موجودہ اردو میں فعل متعدی اپنے مفعول کے تابع ہوتا ہے۔

"میں نے روٹی کھائی" "ہم نے روٹی کھائی" "اس نے روٹیاں کھائیں"

(۲) دکنی اردو میں فعل متعدی اپنے فاعل کے تابع ہوتا ہے۔

ماضی مطلق فعل متعدی کھانا

	واحد مذکر	واحد مؤنث	جمع مذکر	جمع مؤنث
متکلم	میں روٹی کھایا	میں روٹی کھائی	ہم روٹی کھائے	ہم روٹی کھائے، کھائی کھائیں، کھائیاں۔
حاضر	تو کھانا کھایا	تو کھانا کھائی	تم کھانا کھائے	تم کھانا کھائے
غائب	وہ آم کھایا	وہ روٹیاں کھایا	وہ روٹیاں کھائے	وہ روٹیاں کھائے، کھائیں، کھائیاں

(۳) ضمیر اپنے مرجع کے تابع ہوتی ہے۔

(۴) جمع مؤنث کا اثر امدادی فعل تک پہنچتا ہے۔

"جو کچھ باتاں بولنے کیاں تھیاں" (س ر)

(۵) صفت اپنے موصوف کے تابع ہوتی ہے

ع کچیاں کوئلیاں گنوائریاں ناریاں کلیاں کو نوروز آیا (م۔ ق۔ ق۔ ص ۱۳۰)

(۶) اردو میں علامتِ اضافت جنس میں اپنے مضاف کے مطابق آتی ہے لیکن دکنی اردو میں جنس میں

مطابقت کے علاوہ جمع مؤنث کی صورت میں علامتِ اضافت کی بھی جمع بنالی جاتی ہے۔ جیسے: "انوکیاں

انکھیاں"

"محبت کیاں چار باتاں" "جیوں کیاں پیاریاں" "ناز کیاں باتاں" (س ر)

(۷) جمع موصوف کے ساتھ صفت اشاری واحد استعمال ہوتی ہے، جیسے: "اس لوکاں کا کیا جاتا"

"اس باتاں سوں ہمنا کیا کام" اس مستیاں کوں کیا کنا" (س۔ ر)

(تشریح: جمع مؤنث کا اثر صفت اور فعل پر شمالی ہند کی قدیم اردو میں بھی پایا جاتا ہے

لیکن علامتِ اضافت کی جمع کی کوئی مثال شمال کی اردو میں نہیں ملتی۔ یہ غالباً دکنی اردو

میں بھی بہت جلد متردک ہو گئی تھی۔ سب رس تک میں وجہی نے بعض اوقات اس سے

انحراف کیا ہے: مثلاً

"نظر کی انکھیاں باندیا" (بجائے نظر کیاں انکھیاں باندیا)

اردو کے عہد بعہد کے نحوی ارتقا کی تشکیل حسب ذیل جملے میں تبدیلیوں کے ساتھ دکھائی جاسکتی ہے:

- (۱) جواہرات کیاں رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیاں (دکنی اردو)
- (۲) جواہرات کی رنگ برنگیاں کوٹھریاں بھریاں تھیاں (سترھویں صدی کی اردو)
- (۳) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھریاں تھیں (اٹھارویں صدی کی اردو)
- (۴) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھریں تھیں (انیسویں صدی کی اردو)
- (۵) جواہرات کی رنگ برنگی کوٹھریاں بھری تھیں (جدید اردو)

شمالی ہند میں اردو (۱۷۰۰ یا ۱۸۵۷ء)

شمالی ہند میں ۱۷۰۰ء تک، ریختہ کی شکل میں کھڑی بولی کا ادبی ارتقا ہو چکا تھا لیکن برج بھاشا کی ادبی حیثیت ابھی تک مسلم تھی۔ شاہ جہاں کی آگرے سے دہلی واپسی (۱۶۵۸ء) کے بعد ممکن ہے زبانِ دہلی کو اور مہمیز ملتی اگر اورنگ زیب ۱۷۸۲ء کے قریب دکن جاکر وہیں کا نہ ہو رہتا۔ درحقیقت شاہ جہاں آباد ابھی مکمل طور پر ادبی ولسانی مرکز بننے بھی نہیں پایا تھا کہ اورنگ آباد آباد ہو گیا۔ ۱۶۸۶ء اور ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب کی فتح بیجاپور اور گولکنڈہ کے بعد شمال دکن کے تہذیبی باب پھر کھل گئے۔ اس زمانے میں شعراء ادباء اور اہل علم کی جس قدر آمدورفت دہلی اور دکن کے درمیان رہی ہے اس کی نظیر کسی اور زمانے میں نہیں ملتی۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب حکمرانی کی ایک طویل مدت ختم کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوتا ہے۔ بادشاہت پھر لال قلعہ اور دہلی کو لوٹ آتی ہے۔ اس وقت، زبانِ دہلی تخلیق کے لیے تیار تھی۔ لوگ فارسی سے اوب چکے تھے۔ اسی زمانے میں (۱۷۲۰ء) ولی کا دیوان دہلی پہنچا تو وہاں کے کوچہ و بازار میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ جوشِ تتبع میں دہلی کے شعرا نے نہ صرف ولی کے اسلوب شعر کی پیروی کی بلکہ اکثر ولی کی زبان کے ایسے متروک الفاظ تک استعمال کر گئے جو "بموافق محاورہ شاہ جہاں آباد" نہ تھے۔ مثلاً کم از کم ایک شاعر نے دکنی اردو کے کلیدی لفظ نکو (حرف تخصیص) کو اپنی غزلوں میں جگہ دی جس سے زبانِ دہلی بالکل نا آشنا تھی، اس لیے کہ دکنی میں یہ مراٹھی سے مستعار آیا ہے۔

کیوں صحبتِ بدایں میں نکوروئے بیٹھ کر

بولے ہے طور غم سنی یکر و کا جی گھٹا

مجھ کوں واعظ نکو نصیحت کر یار جس سے ملے بتادوفن (یکرو)

شمالی ہند کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر جمیل جالبی کے مطابق شاہ مبارک آبرو (۱۷۳۳ - ۱۷۸۴ء)

ہیں نہ کہ نواب صدرالدین فائز۔ وہ اٹھارویں صدی کے آغاز کی زبانِ دہلوی کے پہلے نمائندے ہیں۔ اس سے قبل

جن شعرا کی زبان سے ہم نے بحث کی ہے (محمد افضل افضل اور روشن علی) ان کا تعلق نواح دہلی سے تھا۔ ایک کانارنول (ہریانہ) اور دوسرے کا، سہارن پور، سے۔ اسی لیے ان کی زبان غیر متعین اور غیر معیاری ہے۔ لیکن آبرو کی زبان کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ وہ دہلوی ثم دہلوی ہیں۔ ہر چند یہ زبان شاعری کی زبان ہے جو بول چال کی زبان سے کافی مختلف ہوتی ہے لیکن تمام زبانوں کے عہد بعہد ارتقا کی داستان کی بنیاد بہر حال ان کا تحریری ادب ہی ہوتا ہے۔ جمیل جالبی کا یہ خیال کہ "آبرو کی زبان اور دکنی اردو میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں" صحیح نہیں۔ اگر دکنی اردو سے ان کی مراد ولی کی زبان ہے تو ان کا یہ بیان کسی حد تک صحیح ہے لیکن اگر اس سے مراد محمد قلی قطب شاہ اور نصرتی کی زبان ہے تو دونوں کے محاورے اور قواعد میں اسی قدر فرق ہے جس قدر کسی زبان کے ارتقا کے تین سو سال میں ہونا چاہیے۔ اورنگ آبادی اردو (خصوصاً ولی اور سراج کی زبان) تو درحقیقت عالم گیر کے عہد کی "شاہ جہاں آبادی" ہی کی ایک شکل ہے جس میں وجہی اور نصرتی کی زبان کی صرف باقیات مل جاتی ہیں۔ اٹھارویں صدی کے نصف اول کی زبان (جس کے آبرو پہلے نمائندے ہیں) اس صدی کے نصف دوم کی زبان دہلی اور دکنی اردو کے اورنگ آبادی روپ کے درمیان کی کڑی کہی جاسکتی ہے۔ حسب ذیل اسکی لسانی خصوصیات ہیں۔

صوتیاتی خصوصیات

(۱) تخفیفِ مصوٰۃ اس کی بھی خصوصیت ہے لیکن اس حد تک نہیں جس حد تک ہم دکنی اردو میں مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی نسبت سے اس میں مشدد الفاظ بھی اس کثرت سے نہیں ملتے جس قدر محمد قلی قطب شاہ وجہی، نصرتی یا شمال میں روش علی کی زبان میں پائے جاتے ہیں۔ ڈیڑھ سو سال تک (۱۵۰۴ تا ۱۶۴۸) اگرہ دارلسلطنت رہنے کی وجہ سے اردو میں تخفیفِ مصوٰۃ اور نتیجتاً مشدد الفاظ کے استعمال میں کمی آجاتی ہے۔ نوادرالالفاظ (۱۷۵۱ء) میں خان آرزو کا جو ردعمل ہریانوی عبدالواسع ہانسوی کے تلفظ کے خلاف ملتا ہے وہ اسی کی نشان دہی کرتا ہے۔ تاہم تخفیفِ مصوٰۃ کی خاصی مثالیں اس عہد کے شعراء و مصنفین کے یہاں مل جاتی ہیں:

- (۱) چندنی (چاندنی، دف)، جگہ (ق م د) (اس عہد کے دیگر تمام مصنفین کے یہاں "جاگہ" ہے)، چدڑیں (ق م د)، گل (= گال، دف)، سرج (= سورج، دف)، چٹ (= چوٹ، ک م) توں توں (= یتوں یتوں، ک م)
- (۲) اس کے برعکس مختصر مصوتوں کو طویل مصوتوں میں بدل دینے کا رجحان بھی جاری رہا ہے۔
- جاگہ (دآ، ک م)، پھیر (= پھر، ک ز، دآ، اح، دن، ک م)، ناہیں (دف)، باقی (ک ز) باقی (دف، ق م د) لوہو

(د آ، اح، ک م) راکھنا (د ف، اح)، ہانسی (= ہنسی، ق م د) پات (د ف، ق م د)، پھاندا (د ف) پھانٹا (دن) لاگا (د ف، دن، ک م)، مائی (یہ لفظ دکنی اردو سے لے کر اٹھارویں صدی کے تمام مصنفین کے یہاں اسی تلفظ کے ساتھ ملتا ہے۔ اسکا، مئی، تلفظ بہت بعد کا ہے۔) آنکھیاں (د ح)

ع سبزی یہ پشت لب کی تری آنکھیاں سوں دیکھ (دیوان قدیم: حاتم) دیوان زادہ (۱۷۵۵ء) میں حاتم نے یہ مصرع بدل کر یوں کر دیا ہے۔

ع سبزے میں پشت لب کے ترے عکس رنگ پاں

(۳) مصوتوں کو انفیا نے کا رجحان اب تک بہت عام تھا:

لچھمیں (= لچھمی، ک ز)، ملاں (د آ)، کرناں (د آ) کوں (ک ز، د آ، دن، اح)، نیں (= نے، دا، ق م د، ن ط م) سیں (= سے، د آ، اح، د ف، دن، ق م د) توں (= تو، دا، اح، ن ط م تقریباً سب مصنفین کے یہاں) سانوں (= ساون، دن، ق م د)، آگیں (اح)، تیں (د ف، ق م د)، پریں (= پری، ق م د)، مرناں (دا)، پہلیں (اح، ق م د)، کوچ (ک ک) پیسے (= پیسے، ک ک) نائک (ق م د) ناچ (ق م د) ہوناں (ق م د)، تیریں (ق م د) میریں (ق م د)، سپناں (ق م د) جاماں (اح)۔ اعداد میں بھی یہ انفیت ملتی ہے۔ کربل کتھا میں یہ اعداد آئے ہیں: گیارہ (گیاراں)، بارہ (باراں)، تیرہ (تیراں) چودہ (چوداں)، سترہ (ستراں)، اٹھارہ (اٹھاراں) جو آج بھی اہل دہلی کے تلفظ کی خصوصیت ہے۔ ان میں غنہ ہائے مختلف (اں)

(۴) اس کے برعکس غنہ کو حذف کردینے کی مثالیں بھی اس عہد میں مل جاتی ہیں۔ یہ خصوصیت دکنی اردو میں بھی پائی جاتی ہے۔

نید (= نیند، ک ک، ق م د) قیچی (= قیچی، ق م د) مگنا (ق م د)، کوآ (ق م د)، لیڈی (= لیڈی، ق م د) (د آ) (ق م د)، ما (= ماں، ق م د) اور دیگر مصنفین کے یہاں بھی۔ باغ و بہار میں "ما باپ" ہے) مہدی (مینہدی، ق م د) (مَدنا (= مَدنا، ق م د)

(۵) ساکن کو متحرک بنا دینا، یہ رجحان روشن علی جیسے قصباتی شاعروں کی حد تک نہیں لیکن "فصحائے دہلی بھی" عوامی تلفظ کے دباؤ پر اس سے نہیں بچ سکے ہیں۔

نَبْضَ (اح)، نَذَرِ دل کو نَذَرِ کرو تب اوس اوپر نظر کرو (اح)

گرم (اح)۔ نین، رین، حَسَن د ف)

(۶) متحرک کو ساکن بنانے کی خصوصیت پنجاب میں عام ہے اس کی چھوٹ کبھی کبھی "مرزایان

دہلی" تک پہنچ جاتی ہے۔

مَرَض اب تک یہ مَرَضِ عشق کا پایا نہیں ہنوز (اح)

پلک، ہرن، کُرن (د ف)

(۷) درمیانی (ہ) اور نفسی (ه) کو حذف کر دینا دکنی اردو کی عام خصوصیت رہی ہے، دہلی اور اس کے نواح کی بولیوں میں بھی تلفظ کا یہ عمل شدت سے ملتا ہے، جو بول چال کی اردو میں آج بھی موجود ہے۔
قدما نے دہلی اسے شعر میں بھی باندھ دیتے تھے۔

نیس (= نہیں۔ حاتم، ناجی بلکہ تمام شعرائے متقدمین اور فضلی اور عیسوی خاں کے یہاں یہ تلفظ موجود ہے) راک (= راکھ، د ف) کاچن (= کاچھن، د ف)، پنکری (= پنکھڑی، د ف) ٹُج، مُج، سانج (ک ک) (۸) اس کا الٹا رجحان یعنی ہائے مخلوط (ه) کا اضافہ بھی کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ ہم دکنی اردو میں دیکھتے آئے ہیں۔ یہ پنجابی، ہریانوی اور برج بولیوں کی بھی خصوصیت ہے۔

گہیو (= گہیوں، ک ز)، بگھولے (= بگولے، دا) تڑپہنا (تڑپنا دا، ح، ک م) چیلہ (= چیل، نوادر)۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ پرگہنا (= پرگنہ، د ف)، جھوٹہ جھوٹھا (ک ک) ہونہ (= ہوں، ق م د) کلہ (کل د ف، ک ک، ق م س) بھا
بھی (نوادر)، دھوکھا (نوادر)، ہوٹہ (ک م) بھیکہ (ک م) مچھلکا (ک م)، بھل (بل ک م)،
(۹) دکنی اردو میں "ق" کا تلفظ "خ" کیا جاتا ہے۔ یہ خصوصیت شمالی ہند کی قدیم و جدید زبان میں
گاہ گاہ مل جاتی ہے:

مذاخ (= مذاق، دا، ق م د، ب ب)

ع عاشق ستاونے کو سمجھتا ہے کیا مذاخ (آبرو)

دہلی اور اس کے نواح میں عوام آج بھی وَخْت (وقت)، صندوق (صندوق)، بندوخ (بندوق) اور
اتفاق (اتفاق) بولتے ہیں۔

(۱۰)، عربیت کے زیر اثر کبھی کبھی، ک، کا تلفظ، ق، بھی کر لیا جاتا ہے: گاہق (= گاہک) ع گاہق جو
اس بازار میں کے ہیں (آبرو)

(دہلی کی کرخنداری اور عوامی بولی میں کبوتر کو "قبوتر" کہہ لیتے ہیں)

(۱۱) (ڑ) پر (ڈ) کو ترجیح۔ برج بھاشا کے زیر اثر اردو کا صوتی سفر (ڈ) سے (ڑاور) کی جانب ہوا ہے۔
جیسے ٹھڈی سے ٹھوڑی، گڈی سے گاڑی، گڈھا سے گڑھا، پھلواری سے پھلواڑی، کڑوڑ سے کروڑ لیکن قدیم اردو
میں (ڈ) کی نمایاں حیثیت قائم تھی:

کاڈھ (کارھ) (دا) بڈھاؤنا (= بڑھانا، نوادر)

بڈھئی (بڑھئی، ک ک)، بڈھیا (= بڑھیا، ک ک)، بوڈھا

(= بوڑھا، ک ک)، بڈھاؤن (= بڑھاؤن، ک ک) بڈبھس

(= بڑھس۔۔۔۔ نوادر) پاڈہ (= پاڑہ۔۔۔۔ نوادر)، ڈیوڈھی
 (= ڈیوڑھی۔۔۔۔ نوادر) ماڈھی (= ماڑھی۔۔۔۔ نوادر)، ز، کا، ر، میں تبدیل ہوجانا
 جھری (= جھڑی) لال بادل کی تجھ جھری ہے یاد (فائز) (قافیہ پری، سرسری وغیرہ)

صرفی خصوصیات

جنس

تذکیر و تانیث کے نقطہ نظر سے اس عہد کی اردو موجودہ اردو سے حسب ذیل الفاظ میں مختلف ہے:
 مذکر: بہار (د، ف، جان (دا، ح، ک، ک، ک م)
 (یہ لفظ دکنی اردو سے مسلسل مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ دکنی اردو میں اس کا مترادف، روح، بھی کلمتہ الحقائق میں مذکر استعمال ہوا ہے)
 سوگند (ک، ک) غرض (ک، ک)، اصل (ک، ک)، آیت (ک، ک)، راہ (ک، ک)، وحی (ک، ک)، پرواز (ک، ک)، کمر (ک، ک)، سیر (ک، ک)، شام (ک، ک)،

تعداد

اردو میں مختلف حالتوں میں جمع کے لیے مختلف علامتیں لگائی جاتی ہیں لیکن ان میں سب سے اہم تبدیلیاں وہ ہیں جو جمع کی حالت میں حرف ربط آنے سے پیدا ہوتی ہیں۔
 مذکر اسماء میں جمع کے لیے آخر میں (و، ون) بڑھا دیا جاتا ہے۔ جمع کی یہ شکل اٹھارویں صدی میں ابتداء سے زبان میں رائج نظر آتی ہے۔ یہ کھڑی بولی کی معیاری شکل ہے جس کا بھرپور استعمال ہمیں روشن علی کے عاشور نامہ میں ملتا ہے جو ۱۶۸۸ء کی تصنیف ہے۔ اس دور کے شعرا و مصنفین نے ہریانوی (ا، ان) کی علامت جمع کے ساتھ ساتھ اس کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے آخر میں (ا، یا) ہوتی ہے، حرف ربط آنے سے جمع میں ان کا الف یا (ہ) گرجاتا ہے جیسے لڑکا سے لڑکوں، پردہ سے پردوں۔ جمع مونث کا (ا، یا) (ی، ی) بھی (و، وں) سے بدل جاتا ہے، جیسے لڑکیوں نے، دھونبوں نے۔ جن الفاظ کے آخر میں (واو) ہوتی ہے، خواہ وہ مذکر ہوں یا مؤنث حرف ربط کے آنے سے ان کی جمع دونوں صورتوں میں ایک ہی ہوتی ہے، یعنی آخر میں (و، وں) بڑھا دیا جاتا ہے جیسے جو روؤں، آرزوؤں، ہندوؤں۔ اٹھارویں صدی سے (و، وں) کی جمع کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں:

انکھیوں (دا)، رقیبوں (دا) آرزوؤں (دا) محبتوں (دا) دشمنوں (دا) چھتھوں کے کواڑ (= چھاتیوں کے

کواڑ۔۔ (دا) ، کاندھوں (دا) گردنوں (دا)

شاہ حاتم کے دیوانِ قدیم میں (۔ وں) کی جمع پر مشتمل قافیہ میں ایک مکمل غزل موجود ہے۔ جس کا مطلب صاف ہے کہ ۱۷۲۸/۲۹ء سنہ سے قبل (جو حاتم کے دیوانِ قدیم کی تکمیل کی تاریخ ہے) دہلی کا شاعر (وں) کی جمع کا عام طور پر استعمال کرنے لگا تھا۔

دل کیا ٹکڑے نین ابرو کے تلواروں سیٹی

کیوں اڑے تھا جا کے یہ ہشیار مے خواروں سیٹی

دیگر قوافی یہ ہیں : خارون، چارون، مارون، یارون، ایک اور غزل (ص ۱۲۰) کے قافیہ نگاہوں، راہوں، شاہوں، آہوں اور گناہوں میں ایک دوسری غزل میں (ص ۱۹۱) میں آنکھیوں، رقیبوں کے ساتھ ساتھ مفرد طور پر غزلاں، عاشقاں اور زلفاں غالباً فارسی کے زیر اثر (یاد کنی اردو کی لسانی روایت کے مطابق) استعمال کیا ہے۔ ایک دوسری غزل (ص ۱۸۴) میں فوجاں کماناں کے ساتھ ہندی بھناں استعمال کیا ہے (وں) کی جمع کس طرح (اں) کی جگہ اٹھارویں صدی کے نصف اول میں لے رہی تھی اسکا بہترین مظہر حاتم کے دیوانِ زارده (۱۷۵۵ء) کی اصلاحیں ہیں۔ دیوانِ قدیم (۱۷۲۸/۲۹ء) کی غزل کے ایک مصرعے کی اصلاح اس طرح کی گئی ہے :

دیوانِ قدیم : ع شوخ کی آنکھیاں گلابی آج ہیں مثلِ شراب

دیوانِ زارده : ع شوخ کی آنکھیں گلابی آج ہیں مثلِ شراب (ص ۱۰۶)

ایک دوسری غزل میں "انجھواں" کو بدل کر "آنسو" کر دیا ہے (ص ۱۰۰)

مزید الفاظ : خطروں (حاتم (قدیم)، عاشقوں (حاتم (قدیم)،

ایک ہی قدیم غزل میں چشموں اور بھنواں (ص ۱۱۹)

شعر کی زبان عموماً روایت پسند ہوتی ہے، پھر دہلی کے متقدمین شعرا کے سروں پر ولی کا بھوت سوار تھا لیکن اسی عہد کے نثر نگار فضلّی نے کربل کتھا (۱۷۳۲/۳۳ء) کی زبان میں اس بات کا مکمل ثبوت دیا ہے کہ اردو کی مسلم جمع کا قاعدہ (وں) کا ہے نہ کہ (اں) کی علامت سے بنائی گئی ہے : اونٹاں (۲۱۸) اور گھاواں (جمع گھاؤ) ۔۔ "گھاواں بے شمار (ص ۱۱۳)

ان کے برعکس فضلّی کا صیغہ جمع ہمیشہ (وں) کا ہوتا ہے : رخساروں ۴۷، جنوں ۴۷، مصیبتوں ۴۷، آنکھوں ۴۸، فرزندوں ۴۹، دشمنوں ۵۱، یتیموں ۱۲۶، گھروں ۴۷، لڑکوں ۶۰، اصحابوں (جمع الجمع جو بار بار آیا ہے) ۶۲، مردوں ۶۲ عورتوں (عموماً عورات استعمال کیا ہے) ۶۶، مومنوں ۶۷

ان الفاظ میں ہندی، فارسی یا عربی الفاظ کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے جیسا کہ بعض اس دور کے شعرا کے یہاں مل جاتی ہے۔

قصہ مہر افروز دلبر (تقریباً ۱۷۵۴ء) میں جمع کی بیشتر شکلیں (و) سے مرکب ہیں۔ البتہ ایک آدھ (اں) کی جیسے بھوان اور برج بھاشا کے بتبع میں ایک آدھ (ن) کی بھی مل جاتی ہیں جیسے : آنکھن (= آنکھوں) (ص ۱۱۹)۔ (و) کی جمع کی بعض مثالیں :

بادشاہوں، امیروں، پتلیوں، جھولوں، پانواؤں، نادانوں، محلوں، خواروں، درختوں، پھلوں، پھولوں، پریوں، نصیبوں، دیوواؤں، بنگوں، پیاروں، بہالوں، چھاکروں، حوضوں، نقاروں۔
ان میں ہندی، فارسی یا عربی الفاظ کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔

فائز کی زبان کے سلسلے میں مسعود حسن رضوی نے یہ خیال ظاہر کیا ہے ۔ ۔ ۔ " فارسی اور عربی لفظوں کی جمع فارسی قاعدے کے مطابق بغیر فارسی ترکیب کے بھی استعمال کی گئی ہے مثلاً زلفاں، حوراں، نظراں، اس سے بڑھ کر یہ کہ ہندی لفظوں کی جمع اکثر فارسی قاعدے کے مطابق بنائی گئی ہے "

میرے خیال میں یہ لسانی توجیہ صحیح نہیں۔ دراصل "ان" کی جمع کا قاعدہ فارسی تک محدود نہیں یہ پنجابی اور ہریانوی تک میں رائج ہے اور اس کا رشتہ قدیم پراکرت سے ملتا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس اعتبار سے فارسی اور ہندوستان کی مذکورہ بالا بولیوں میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ دکن کے بعض محققین نے بھی، ہند آریائی زبانوں کے ارتقا کی تفصیلات پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے اسی قسم کا اظہار خیال کیا ہے، حالانکہ جمع کی علامت (اں) کی تفصیل ہند آریائی زبان کے ایک ماہر نے یہ بتائی ہے۔

"اے اُن۔ - مذکر(ا) خاتمے والے الفاظ کے ساتھ جب جمع میں، حالت کی جمع آتی ہے تو آخری (آ)، (اُن) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ سنسکرتی مَصَوْتِے کے خاتمے والے الفاظ کے ساتھ حالتِ اضافی کی جمع میں حالت کی علامت استعمال ہوتی ہے۔ پراکرت میں (آنم) (آنٹم) بنتا ہے۔ پراکرتوں میں حالتِ اضافی کی علامت کا استعمال دوسری حالتوں میں بھی کیا جاتا تھا۔ اپ بھرنش کے زمانے میں حالتِ اضافی کا استعمال دوسری حالتوں میں زیادہ ہونے لگا۔ سنسکرت کی حالتِ اضافی کی جمع کے لاحقے کو جدید ہند آریائی کی حالت کی جمع میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دکنہی میں حالتِ فاعلی کے علاوہ دوسری حالتوں میں (-اں) کی علامتوں کی جمع میں حالتِ اضافی کی جمع کو بنیا دبنا یا جاتا ہے۔ سنسکرت (آم) یا (آنم) پراکرتوں میں (آنٹم) بنتا ہے، اور ہندی میں (انٹم) (اوں) یا (اون) کی شکل اختیار کرتا ہے۔ کچھ بولیوں میں یہ (آنٹم) (اُن) میں تبدیل ہوتا ہے۔ "

دوسرے الفاظ میں اردو کے (و = اوں) او (آں) جمع کی دونوں علامتوں کا مآخذ پراکرت کا (آنم) ہے۔ مختلف بولیوں نے مختلف علامتوں کو اپنا لیا۔ دکھنی، ہریانوی اور پنجابی میں یہ (ان) کی شکل میں ہے، قدیم اردو میں اٹھارویں صدی کے وسط تک اس کی دونوں شکلیں رائج رہیں، بالآخر کھڑی بولی کے (اون = وں) کی فتح ہوتی ہے اور اس صدی کے آخر تک (آں) کی شکل اردو سے غائب ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ (ان) کے رجحان کو فارسی سے بھی تائید ملی ہوگی جب کہ بعض شعرا نے اکثر فارسی الاصل الفاظ کی جمع میں یہی علامت استعمال کی ہے۔

ع لگا ہے جان لبان کو مرے دہن تجھ بن (آبرو)

لیکن اس بارے میں کوئی کلیہ نہیں بنایا جاسکتا۔ فارسی تراکیب میں تو یقیناً یہ فارسی کے زیر اثر کہی جائے گی لیکن فارسی کے مفرد الفاظ میں (ان) کی جمع کا مآخذ فارسی بھی کہا جاسکتا ہے اور ہندی بھی مثلاً حاتم کے قدیم دیوان میں زلفاں (ص ۱۳۴) بھی ملتا ہے اور زلفوں (ص ۱۴۹) بھی۔ زنجیر زلفاں (ص ۱۰۳) کی ترکیب بھی ملتی ہے، فائز کا ایک مصرع ہے۔

ع بھواں تیری شمشیر و زلفاں کمند (ص ۱۱۵)۔ یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ زلفاں میں (ان) علامت جمع فارسی کی ہے یا ہندی کی۔

(ان) کی جمع

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہو گئی کہ (ان) کی جمع دکنی اردو کا غالب و نمایاں طریقہ جمع ہے۔ اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ابتدا میں آبرو، فائز، حاتم وغیرہ نے (ون) کی جمع کے ساتھ ا سے بھی بکثرت استعمال کیا ہے۔

بھواں (دا، اح، دف)، زلفاں (دا، اح)، لٹاں (دف) ہونٹاں، ہاتاں، باتاں، دانتاں (دف)، انکھیاں کی ردیف میں آبرو کے دیوان میں چار غزلیں ہیں (ص ۱۲۳)، انجھواں (اح)

ان شعراء کے برعکس اس عہد کے نثر نگاروں فضلی اور عیسوی خاں نے (ان) کی جمع کو صرف گاہ گاہ استعمال کیا ہے۔ کربل کتھا میں صرف، حاضراں، اور "گھاوان بے شمار" میں، گھاؤ، کی جمع لکھی ہے۔ قصہ مہر افروزو دلبر میں صرف، بھواں، ملتی ہے۔ رفتہ رفتہ شعر بھی ا سے "بموافق محاورہ شاہ جہاں آباد" نہ سمجھ کر اس سے اجتناب کرنے لگے۔ چنانچہ سودا و میر کے یہاں اس کا استعمال باقیات کے طور پر صرف فارسی اسماء یا صفات ضمائر اور حروف میں جھلک آتا ہے:

ع جفائیں دیکھ لیاں بے وفائیاں دیکھیں (میر)

ع اس چرخ نے کیاں ہیں ہم سے بہت ادائیں (میر)

ع مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں (میر)
ع روتے گزرتیاں ہیں ہمیں راتیں ساریاں (میر)

اسمائے ضمیر

اٹھارویں صدی کے نصف اول میں ولی کے اسلوبِ سخن کے زیر اثر دہلی کے شعرا اسمائے ضمیر کے استعمال میں بھی زیادہ محتاط نہیں دکھائی دیتے۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہی اور بہت جلد اس صدی کے نصف آخر سے ان میں استحکام آتا گیا۔
اس صدی کے نصف اول کے ضمائر کی جدول اس طور پر تیار کی جاسکتی:
ضمیر متکلم:

واحد	جمع
فاعلی حالت	ہم
مفعولی حالت	ہم، ہمن، ہمنا
اضافی حالت	ہم، ہمارا (- ری، رے)
	ہمنا، ہمارا (- ری، رے)
	مج، مجھ

تشریحات

مجھ (= میرے)؛ "مجھ دل کو بہت ہے امید" (دف)، "مجھ آشیانے کا (ک م)
ہمن (= ہم) ع کہ جس کی نگہ کے بندھے ہیں ہمن (دا)
ع دوری نہ کرو ہمن سے اس حد (دف)
ہمن (= ہمارے) ع ایک دم مہر کر ہمن حق میں (دف)
ہمنا (= ہم) "بولتا تھا ہمناسیں" (دا)
ہماروں (= ہمارے کی جمع) "پس قائم رکھو حکم ہماروں کو" (ک ک ص ۵۴)
(نہایت شاذ استعمال ہے جو کسی اور جگہ نہیں ملتا)
ہم (= میں) کے لیے موجودہ اردو کی طرح اس دور میں بھی پایا جاتا ہے۔
ہم (= ہمارے) ع محبت میں اگر ہم پاس آؤ گے تو کیا ہوگا (اح)
اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں، نصف اول کی دو ضمائر متروک ہو جاتی ہیں "ہمن" اور "ہمنا"۔ ان

کی جگہ جدید شکلیں "ہم" اور "ہمارا" کلی طور پر لیتی ہیں:

ضمیر حاضر

واحد	جمع
فاعلی حالت:	تو، توں، تیں، تم
	تمن
مفعولی حالت:	تج، تجھ، تم، تمنا
اضافی حالت:	تیرا، ترا، (ری، رے) تمہارا، (ری، رے)
	تمہارا، (ری، رے)
	تمن، تجھ

تشریحات

توں (= تو)، تو، کی یہ انفی شکل اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں متردک ہوتی گئی ہے قائم عیسوی، فضلی، اور تحسین کے یہاں خال خال ملتی ہے۔

تیں (= تو): یہ ضمیر متکلم اس دور میں کمتر پائی جاتی ہے لیکن موجود ہے فضلی کے علاوہ دیگر تمام شعراء و مصنفین کے یہاں۔ مثلاً عیسوی خاں کے یہاں مسلسل اور سودا اور میر کے یہاں خال خال ملتی ہے "تیں اس میں کر دیا" (سودا)، کلیات میر فرہنگ

(نوٹ پلیٹس نے اپنی قواعد تک میں (۱۸۸۴ء) سے متکلم اسمائے ضمیر میں شامل کیا ہے، اس نوٹ کے ساتھ کہ اب یہ اردو میں متروک ہے)

تمن (= تم کو، تمہیں) ع یہ نصیحت تمن ہماری ہے (فائز)

تم (= تمہارا) (فائز)

تمہاروں (ضمیر متکلم جمع)، ہماروں، کی طرح صرف کربل کتھا میں آئی ہے۔

تمن (= تیرے) "تمن پاس" (دف)، تجھ (= تیرے) "تجھ حکم" (ک ک)، "تجھ لبان" (دا)، "تجھ قد" (دن) تجھ

لب (دف)، تجھ پاس (ک م)، "تجھ انکھیاں" (ح) تمنا (= تم) (دا)

ضمیر غائب

واحد	جمع
حالت فاعلی:	وہ، اُن نے، دو، اُو
	وہ۔ وے

حالت مفعولی : اس، اُنھوں، اُن

وس، و سے

حالت اضافی : اس کا، وس کا، تیس کا ان کا، ان کی

وے (=وہ جمع)۔ جمع کی یہ ضمیر حاتم، فائز، عیسوی، تحسین، سودا، میر، سب کے یہاں ملتی ہے۔
"وے وے کام سرانجام پائے" (ن ط م)

وس (=اُس) فضلی عیسوی اور مراٹھی ریختہ میں ملتا ہے۔ دہلی کی بولی کا عوامی تلفظ ہے۔

و سے (=اُسے) : عیسوی خاں

اُن نے (=وہ) "اُن نے بھی ہنس دیا" (ن ط م)

تیس کی (اُس کی) "تیس کی دعا سے تیریں اولاد بھی ہوگی اور جیوے گی بھی" (ق م د)

تین (=اُن) "تین سبھوں کو سرکار سے بادلہ پوش کردیو" (ق م د)

ضمیر موصولہ

واحد جمع

جو

جن، جنہوں، جنہیں

جن کا

جن کی

واحد

جو

جس، جن (تعظیاً)

جس کا

جس کی

فاعلی حالت :

مفعولی حالت :

تشریحات

جن (بغیر، نے، فاعلی) : "جن کیا" (مراٹھی ریختہ)، "جن سکھایا" (د ف)

ضمائر استفہامیہ

واحد جمع

کون

کن

کن کا

واحد

کون

کس، کین

کس کا

حالت فاعلی :

حالت مفعولی :

حالت اضافی :

ضمائر تنکر

مفعولی حالت میں، کسی، کے ساتھ "کسو" کا استعمال قابل توجہ ہے یہ مسلسل آیا ہے، فضلی عیسوی

خاں تامیر اور غالب سب نے استعمال کیا ہے :
 "کسو پر نہ کیا (ک ک) ، ع ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا (میر)
 ضمیر اشارہ (قریب)

واحد	جمع
یہ - یو	یہ ، یے
اس ، ان	ان ، انہوں ، انو
اسے ، انہیں	انہیں
اس کا ، ان کا	ان کا

یہ (یہ جمع) (دا) "یہ بھی روتے ہیں" (ق م د)
 یو (یہ) : ع یو رخسار کے مطلع نور پر (دا)
 "یو دیکھ" (ق م د) (دف) (ک ک)
 ضمیر اشارہ (بعید)

واحد	جمع
وہ ، وو ، او	وہ ، وے ، وو
اُس ، وِس	اُن ، وِن ، انہوں ، اُناں
اُن ، انہوں	

وے (جمع وہ) (اح) (ق م د) ، "وے وے کام انجام پائے" (ن ط م ۱۰۳) (لیکن فضلی کے یہاں نہیں ملتا) اس کے بعد سودا اور میر کے پاسپھر موجود ہے۔

اُناں (اُن جمع) "اُناں میں ایک تھی" (دف)
 وِس (= اُس) "وِس سے کہتی ہے" (ق م د)
 اُنہوں (= اس) (تعظیاً) میں نے کہاں انہوں سے " (سودا)

افعال

مصدر

موجودہ اردو میں علامت مصدر "نا" ہے لیکن قدیم اردو اور اٹھارویں صدی تک کی اردو میں بعض دیگر طریقوں سے بھی مصدر کی تشکیل ہوتی تھی۔ ایسے مادے جو مصوتوں پر ختم ہوتے ہیں اکثر "نا" سے قبل ان

میں ایک (و) کا اضافہ کر دیا جاتا تھا مثلاً

جاونا (ک ک۔ ۱۳۲)، پیونا (ک ک۔ ۱۸۹) کھاونا (ک ک۔ ۲۳۳)، گاونا (ق م د۔ ۲۹) آونا (ق م د۔ ۶۱)
اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں یہ شکلیں غائب ہو جاتی ہیں، مصدر کا "نا" اکثر انفی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے:
مارناں (ق م د۔ ۵۳)، نکالناں (ق م د۔ ۳۳۴)
حالیہ تمام

معیاری اردو میں یہ مادے کے آخر میں (- تا) لگانے سے بنتا ہے لیکن اٹھارویں صدی تک کی اردو میں (-
تا) سے قبل ایک (و) کا اضافہ بھی کر دیا جاتا تھا۔

پاؤتا (دا، ص ۵۴) رودتا (ق م د، ص ۲۰۲)، جلاوتا (ق م، ص ۲۰۵)
حالیہ تمام کے جمع مونث صیغے میں چند شکلیں اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہیں کہ موجودہ اردو میں وہ
متروک ہو چکی ہیں۔ مثلاً مادہ "جا" اور "بول" سے:
جاتیں، جاوتیں، جاوتیاں، بولتیں، بولتیاں
روتیاں (ک ک ۱۶۴)، کہتیاں (ک ک۔ ۸۸)
جاتیاں (ک ک ۲۴۰) (س۔ ب ۲۴) ہلتیاں (ک ک۔ ۵۶۶)، بھاگیاں (ک ک ۲۱۴) دیکھیاں (ک م۔ ۲۲۱)،
جلتیاں (ک م۔ ۵۶۶)، آتیاں (ک م۔ ۲۱۴) چلیاں، دیکھیاں (ک م۔ ۲۲۱)، آتیاں (س ب۔ ۲۴)
ماضی مطلق

موجودہ اردو میں ماضی مطلق کی تشکیل کے لیے مادے میں (-ا) کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی
میں کھڑی بولی کی یہ شکل ابتدا سے مستعمل رہی ہے۔ دکنی اردو میں ماضی مطلق (-یا) کے اضافے سے بنتا ہے
جونواح دہلی کی بولیوں میں ہریانوی کی خصوصیات ہے۔ شمالی ہندی اردو میں اس کی مثالیں صرف اسمعیل
امروہوی کی "اردو کی دو قدیم مثنویاں" میں ملتی ہیں۔

بھریا (۱۰۴، ۱۰۹)، پڑھیا (۱۰۵)، کہیا (۱۰۶، ۱۱۹)، ملیا (۱۱۰)، دیکھیا (۱۱۲، ۱۴۴، ۱۱۹)، رہیا (۱۱۵)۔
لیکن اسمعیل کی زبان میں دکنی اردو کی پٹ کافی مل جاتی ہے اس لئے کہ اس کی عمر کا بڑا حصہ عالمگیر کے عہد میں
نواح اورنگ آباد میں گزرا تھا۔ وہ شمالی ہند کا واحد مصنف ہے جو دکنی اردو کی (چ) تخصیصی کو بھی استعمال
کر جاتا ہے۔ اس کے یہاں دکنی اردو کی یہ شکلیں بھی مل جاتی ہیں:

پائیا (دق م۔ ۱۲۵)، آئیا (دق م۔ ۱۵۸)، لائیا (دق م۔ ۱۵۸)، وہ واحد مصنف ہے جو امدادی افعال
کے طور پر اتھا (تھا) اور اتھے (تھے) کو استعمال کرتا ہے۔ شمالی ہندی اٹھارویں صدی کی اردو میں یہ ناپید ہیں،
حالاں کہ عاشورنامہ (۱۶۸۸ء) میں ان کا استعمال پایا جاتا ہے۔

صیغہ امر

صیغہ امر میں خاص اختلاف (و) کے اضافے کا ہے جب مادہ کا خاتمہ مصوتے پر ہو، جیسے :

"بھلا دوں نہیں" (حرف - ۲۴۷)

ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ امر کا تعظیمی صیغہ آئیے وغیرہ "آپ" کے علاوہ تین (تو) کے ساتھ بھی استعمال کیا جاتا تھا، جیسے :

"کلہ تیں نہ آئیے" (ق م د - ۸۹)

"تیں تب آئیے" (ق م د - ۹۸)

اسی طرح اگر مادہ کا خاتمہ مصمتے پر ہو تو اس کے آخر میں (یو) اور مصوتے پر ہو تو آخر میں (ایو) لگادیا جاتا ہے۔

ملیو (ک ک - ۲۷۶)، کہیو (ک ک - ۱۱۵)، جیو (ک ک - ۶۵)، دیکو (ک ک - ۳۶)، ہو جائے (ک ک - ۱۴۳)، ہوئیے، کے بجائے کربل کتھاتا غالب مستعمل رہا ہے۔

ع نہ کھڑے ہو جائے خوبانِ دل آزار کے پاس (غالب)
ان افعال کی مختصر شکلیں بھی مستعمل رہی ہیں۔

دیجیے (ق م د - ۳۶) کیجے (ق م د - ۳)

مضارع

متداول شکلوں کے علاوہ (و) کے اضافے سے بھی رائج رہی ہیں :

ہووے (ک ک - ۶۰)، دیوے (ک ک - ۲۱)، چھپاوے (ق م د - ۳۳۱)، لیوے (ق م د - ۳۲۹)

اردو میں صیغہ حال کی علامت (ت) کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس اعتبار سے اردو (کھڑی) ہریانوی سے بالکل مختلف ہے جہاں (سوں - ساں - سو) کے پیرپہیر سے حال بنتا ہے۔ حال کی یہ شکل اردو نے اپنے ارتقا میں کبھی نہیں اپنائی۔ اسے دکنی اردو کے (س) سے مرکب مستقبل سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

مستقبل

اس دور کی اردو میں مستقبل کی سب سے دلچسپ شکل جمع مؤنث میں ملتی ہے، جہاں دیگر زبانوں کی طرح علامت مستقبل بھی اسی کے مطابق آتی ہے۔

"ہم بغیر تیرے دنیا میں کیوں کر پھریں گیاں۔" (ک ک - ۸۹)

بغیر ترے دیدار کے کیوں کر زندگی کریں گی۔" (ک ک۔ ۸۹)

(گیان) کی یہ شکل کربل کتھا سے مخصوص ہے۔

مستقبل کے صیغے کے مانند (و) زائدہ کے ساتھ بھی آتے ہیں۔ بتلاوے گی (ق م د۔ ۱۰۹)، جیویگی (

ق م د۔ ۱۳۱)، ہوویگا (ک ک۔ ۵۷۸) جاویں گے (ک ک۔ ۱۳۹)، آوے گی (ک م۔ ۴۰۰)

مستقبل کی علامت (-گا) سے کبھی کبھی زمانہ حال کا بھی کام کیا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر امدادی افعال

کے آگے لگادیا جاتا ہے، جیسے :

"ہم جاتے ہیں گے اپنے گھر" (ک ک۔ ۱۴۱) "آگے جاتا ہوں گا" (ک ک۔ ۱۰۶)

فعل کی یہ شکل میر تقی میر بلکہ ان کے بعد تک معیاری سمجھی جاتی تھی۔ اب بعض علاقوں میں صرف

بول چال میں رہ گئی ہے۔ پلیٹس نے اپنی قواعد (۱۸۸۴ء) تک میں اس کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ "ہے" کے

مقابلہ میں "ہیگا" میں زیادہ زور اور تاکید پائی جاتی ہے۔

ماضی مطلق

سب سے قابل توجہ شکل جمع مونث کی ہے، جہاں فعل دیگر زمانوں کی طرح فاعل کے مطابق آتا ہے "

کئی عورتیں نکلیاں" (ک ک۔ ۸۱)، "خیموں سے باہر بھاگیاں" (ک ک۔ ۲۱۷)

میر تقی میر نے تو اس قواعدی شکل کو ردیف بنا کر ایک غزل لکھی ہے :

بار ہاد وعدوں کی راتیں آئیاں طالعوں نے صبح کر دکھلائیاں

عشق میں ایذائیں سب سے پائیاں رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں

اُس مزہ برہم زدہ نے بارہا عاشقوں میں برچھایاں چلوئیاں

اس غزل کے مزید قوانین یہ ہیں : مرجھائیاں، جھمکائیاں، ٹھرائیاں، کھائیاں، بتلائیاں، دلوائیاں، (ک ک۔ میر ۵ /

۱۰۴۔ نولکشور)

انیسویں صدی آتے آتے یہ صیغہ متردک ہو جاتا ہے اور ان کے بجائے : آئیں، دکھلائیں، چلوئیں وغیرہ

مستند مانے جانے لگے۔

متعلق فعل

اُس دور کے حسب ذیل متعلق فعل خصوصیت رکھتے ہیں :

یاں : غم بہت ہے یاں" (ک م۔ ۲۲۶)

تہاں : (=وہاں) "تہاں یہ رہی تھی" (ق م د۔ ۸۸)

- ایدھر: (= اِدھر) "نہ ایدھر گزر کیا" (د د - ۱۱۳)
- جدھر تدر: "پہرتے تو ہو۔۔۔ جدھر تدر (د د - ۸۸)
- ووں: (= اس طرح) "ووں ہی ندائے الہی ہوئی" (ک ک - ۶۱)
- اودھر: (= اُدھر - ک ک)
- تدر: (= وہاں) ع جدھر دیکھا تدر تیرا ہی روتا (ک م - ۱۳۳)
- پھیر: (= پھر) (ک ک - ص ۹۰)
- کلّہ: (= کل) "کلّہ تو تیں نہ آئے" (ق م د - ۸۹)
- آگوں: (= آگے) "آگوں اس کے ایک حوض ہے" (ق م د - ۲۲)
- آنگو: (= آگے) "تب آنگو تو روپے لٹتے جاتے تھے" (ق م د - ۸)
- تُرّت: (= جلدی)
- نپٹ: (بہت) "ایک باغ نپٹ خوبی کا تیار کیا" (ق م د - ۵۱)
- دھک: (= اچانک) "دھک جا کے اس کی بانہ کو پکڑا" (د ف - ۲۰۸)
- نئیں: (= نہیں)
- ناہیں: (= نہیں) ع شہر دلی میں ثانی اب ناہیں (د ف - ۱۹۸)
- (نہیں' کا استعمال کم تر رہا ہے)
- ہمیش: (= ہمیشہ) "ہمیش آرزو مند مرگ کا تھا" (ک ک - ۸۳)
- اب لگ: (= اب تک) "اب لگ توں کہاں تھا" (ک ک - ۱۲۳)
- جد: (= جب) "اور جد تیرے بیٹا ہوئے" (ق م د - ۷)
- تولوں: (= کبھی) "تولوں اس عورت نے کہا" (ق م د - ۱۹)
- کدھو: (= کبھی) "انہوں نے کدھو نہیں دیکھے تھے" (ق م د - ۱۹)
- کد: (= کب) "اس شہر بیچ کد ہے عید اور شادی، نہ معلوم ہوتی تھی" (ق م د - ۱)
- ایتا: (اتنا) "بادشاہ زادہ ایتا خوبصورت ہے" (ق م د - ۱۱)
- تلیں: (= تلے) "اُس پانی کے تلیں۔۔۔" (ق م د - ۲۳)
- سانمنھے: (= سامنے) "سانمنھے پہاڑ کے اوپر۔۔۔" (ق م د - ۲۴)

حروف

سین: (= سے، دف)

سیتی: (= سے) ع سربا تہ دھر، کیوں کرنہ روؤں، دھو ہاتہ بیٹھی تجھ سیتی (ک ک۔ ۱۹۱)

سوں: (= سے) "اُس ہاتہ سوں" (دف۔ ۲۴۰)

تے: (= سے)

نیں: (= نے) "کیا ہے فتح ہم نیں" (د آ۔ ۱۴۱)

لک، لگ: (= تک) "جب لگ توں مجھے مارے" (ک ک۔ ۲۳۱)

لُوں، لَوں: (= تک) "تب لَوں" (ق م د)

کو، کو،ں: کوں، کثرت سے، دیوانِ آبرو۔ دیوانِ حاتم۔

دیوانِ فائز اور قصہ مہر افروز و دلبر میں استعمال ہوا ہے۔

قصہ مہر افروز و دلبر میں، کو، اور، کوں، دونوں شکلیں ملتی ہیں۔

کے: (= کو) "اور اس سوداگر کے رخصت کرتا" (ق م د۔ ۶۳) ("کے" قصہ سے مخصوص ہے۔) بار بار آیا ہے

۔ برج کا لفظ ہے

موں: (= میں) "دل موں میرے:" (ک ک۔ ۱۹۲)

منے: (= میں، دف)

بی: (= بھی) دیوانِ فائز میں اکثر غیر نفسی "بھی" کے طور پر آتا ہے۔

لیئیں: (= تک) "پرناز کی گوشت لیئیں ہے" (ق م د۔ ۴۴)

(اس کا استعمال قصہ کے علاوہ اور کہیں نہیں ملتا۔ بولی کا لفظ ہے)

نحوی خصوصیات

اٹھارویں صدی کی اردو کا بیشتر مواد شاعری پر مشتمل ہے۔ آبرو، حاتم، فائز سے لے کر سودا و میر تک بے

انتہا اور بیش بہا شعری سرمایہ جمع ہو گیا ہے۔ لیکن ایک تو شعر کی زبان محدود مخصوص ہوتی ہے۔ دوسرے

نحوی ساخت کے اعتبار اس میں الفاظ کی ترتیب ضرورتِ شعری کے اعتباراً الٹ پلٹ کی جاسکتی ہے۔

جہاں تک اس صدی کی نثر کا سرمایہ ہے ہمارے پیشِ نظر چار اہم تصانیف رہی ہیں۔ (۱) فضلی کی کربل

کتھا (۱۷۳۳ء)، عیسوی خاں کا قصہ مہر افروز و دلبر (تقریباً ۱۷۵۴ء)، تحسین کی نو طرز مرصع (۱۷۷۵ء) اور

میرامن کی باغ و بہار (۱۸۰۲ء)

ان میں کربل کتھا ایک آزاد ترجمے اور تلخیص کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کے جملوں میں الفاظ کی ترتیب پر فارسی کی نحوی ساخت کا گہرا اثر ملتا ہے۔

"ناگاہ داخل ہوئے اس محل میں پانچ مرد" (ک - ک - ۲۶۳)

تحسین "مرصع رقم" تھے اور انہوں نے "مرصع رقم" تھے اور انہوں نے "مرصع ہندی زبان" جنرل اسم ڈکی دلبستگی کے لئے لکھی ہے جس کا مآخذ فارسی کا چہاردرویش "کا قصہ ہے۔ تحسین نے اس قصے کو بطور "انشا" رقم کیا ہے جیسا کہ اس کے ایک معروف نام "انشاء نو طرزِ مرصع" سے بھی ظاہر ہوتا ہے گلکرسٹ نے میر امن کے باغ و بہار کے اپنے دیبا چے بزبان انگریزی میں لکھا ہے۔

"عطا حسین خاں نے ابتداً اصل فارسی سے اس کا ترجمہ شائع کیا گیا مگر چونکہ اس کی زبان بوجہ کثرتِ تراکیب، محاورہ، فارسی و عربی مغلق اور قابلِ اعتراض مانی گئی تھی اس لئے اس نقص کو رفع کرنے کی غرض سے کالج کے ملازمین میں سے میرامن دہلوی نے مذکورہ بالا ترجمہ سے موجودہ متن تیار کیا ہے۔"

ایک لحاظ سے نحوی ساخت کے تجزیے کے لئے سب سے مستند مآخذ عیسوی خاں کا قصہ مہر افروز و دلبر ہے جو ۱۸۵۴ء کے قریب کی زبان کی نمائندگی کرتا ہے اور دوسری میرامن دہلوی کی باغ و بہار ہے جو ۱۸۰۲ء کی تصنیف ہے جس میں انہوں نے تحسین کی "مرصع ہندی" کو "اردوئے معلیٰ" کی زبان میں باغ و بہار بنایا۔ (الف) جملے میں الفاظ کی ترتیب۔

اردو جملے میں فاعل فعل سے پہلے آتا ہے اگر فعل لازم ہو، لیکن اگر جملے میں فعل متعدی ہو تو پہلے فاعل، اس کے بعد مفعول اور اس کے بعد فعل ہوتا ہے۔

اٹھارویں صدی کی اردو میں فارسی عربی نحوی ساخت کے زیرِ اثر یہ ترتیب اکثر بدل جاتی ہے:

(۱) "ناگاہ داخل ہوئے اُس محل میں پانچ مرد" (ک ک - ۲۶۳)

(۲) "باغبانِ قضا و قدر کے نے بیچ روزِ ازل کے" (ن ط م - ۶۴)

(۳) "گلِ عشرت اس کے کا" (ن ط م - ۶۵)

(۴) "اور کہا کہ بیچ غسلِ صحت اس کی کے جس قدر جلدی کرے گا موردِ عنایاتِ بے غایات ہوگا۔" (ن ط م -

۲۴۳)

(۵) "اسباب تجارت کا بہت سا لایا۔" (ب ب - ۱۱۶)

(۶) "اگر تھوڑا سا احوال اس کا مفصل بیان کرو۔" (ب ب۔ ۷۲)

نحوی ترکیب کا یہ گنجلک اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے جب جملہ طویل ہوتا ہے اور اس میں کئی تابع جملے ہوتے ہیں، جیسے :

"یہ غریب مسافتِ بعید سے معشوقہ اپنی کو، کہ مدار زندگی میری کا اوپر مشاہدہ
جمال مہر تمثال اس کے ہے، ساتھ لئے بہ تہیہ روزگار تجارت پیشگی کے اس
طرف کو آتا تھا جب۔۔۔"

(ن ط م)

نوطرز مرصع (۱۷۷۵ء) اور باغ و بہار (۱۸۰۲ء) کی مذکورہ بالا مثالوں کے برعکس قصہ مہر افروز و دلبر (۱۷۵۴ء) کے جملوں کی نحوی ساخت عام بول چال کی اردو سے قریب تر ہے۔ صرف کہیں کہیں حروف ربط کا استعمال فارسی نحو کا اثر لئے ہوئے ہیں۔ (ص ا)

"اقلیم ہندوستان کی میں ایک شہر تھا کہ تس کا نانو عشق آباد تھا۔ تیس میں حکم روا اُس جگہ کا عادل شاہ بادشاہ تھا۔ ہفت اقلیم کے جوہر ایک بادشاہ تھے سو پیش کش اور نوکری اس کی کے میں سب حاضر رہتے تھے۔ اطاعت اس کی مانتے تھے۔ جہاں تک کہ ملک اس کا تھا، سو عدالت و انصاف اور بخشش و انعامات سے کوئی ایسا نہ تھا کہ کسی بات سے محتاج ہوئے۔ اور اس شہر کے بیچ میں کد ہے عید اور شادی، نہ معلوم ہوتی تھی، کیوں کہ عید اور شادی رات دن رہتی تھی، اور چھوٹا بڑا جو اس شہر میں رہتا تھا سو سوائے راگ اور ناچ، عیش و عشرت کے اور دوسری بات نہ جانتا تھا۔۔۔"

مذکورہ بالا تمام مثالوں میں حروفِ اضافت (کا، کے، کی) کا استعمال فارسی نحوی قاعدے کے مطابق ہوا ہے۔ اس سے مفر عیسوی خاں، مصنف، قصہ مہر افروز و دلبر، کو بھی نہ تھا۔
"اور نوکری اس کی کے میں سب حاضر رہتے تھے"

جو اردو کے قاعدے کے مطابق "اور اس کی نوکری میں سب حاضر رہتے تھے" ہونا چاہیئے تھا۔ مزید مثالیں

"چھوٹی بیٹی امام کی سے" (ک ک۔ ۲۱۷)

"شبستانِ عمرو دولت اس کے کا" (ن ط م۔ ۶۵)

"لائق میری نذر کے" (ب ب۔ ۱۱۶)

(ب) ترتیبِ کلام

(۱) فاعلی، نے، کے حذف سے اس صدی میں ترتیبِ کلام میں فرق پڑ جاتا تھا۔ یعنی متعدی فعل ایسی صورت میں اپنے فاعل کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے نہ کہ مفعول کے ساتھ :

- ۱۔ "وہ دونوں بات سنے" (یعنی ان دونوں نے بات سنی) (ک ک۔ ۱۲۵)
- ۲۔ "وہ جواب نہ دی" (یعنی اس نے جواب نہ دیا) (ک ک۔ ۱۲۴)
- ۳۔ "تب عباس کہے" (یعنی تب عباس نے کہا) (ک ک۔ ۱۲۶)
- (۲) فاعل جمع مونث ہو تو اس کا فعل بھی اس کے تابع آئے گا۔
- ۱۔ "کشتیاں سر بہ مہربینچ نظر مبارک ملکہ ماہ سپا کے گزارنیاں (ن ط م۔ ۹۳)
- ۲۔ "ع نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی لڑیاں (ن ط م۔ ۸۵)
- ۳۔ "یہ باتیں ہوتیاں تھیں کہ۔۔۔" (ب ب۔ ۱۱۱)
- ۴۔ "رنگ بہ رنگ کی پوشاکیں پہنے ہوئے سینکڑوں پری پیکریں جھولیتاں ہیں۔" (آم۔ افسوس)
- ۵۔ بارہا وعدوں کی راتیں آئیاں طالعوں نے صبح کرد کھلائییاں
عشق میں ایذاں سب سے پائیاں رہ گئے آنسو تو آنکھیں آئیاں
(میر)
- (۳) فاعل جمع مونث ہو تو صفت بھی جمع کی شکل اختیار کرے گی۔
- ع نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں۔ (سودا)
- (۴) اردو نحو کا عام قاعدہ ہے کہ صفت اسم یا ضمیر سے پہلے آتی ہے لیکن اکثر فارسی قواعد کے زیر اثر اس عہد میں یہ ترتیب الٹ جاتی ہے۔
- ۱۔ "باپ ہمارے نے" (ک ک۔ ۱۲۴)
- ۲۔ "اور جانور اقسام اقسام طرح خوش رنگ بیٹھے ہیں۔" (ق م د۔ ۱۶)

اختتامیہ

انیسویں صدی کے آغاز تک اردو زبان اپنی صوتیات، صرف و نحو اور کسی حد تک لفظیات کے نقطہ نظر سے ایک ایسی شکل اختیار کر چکی تھی کہ دہلی اور اس کے باہر کے شعرا اور ادیب اس کا تتبع کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ۱۷۹۳ء میں مرزا جان طیش دہلوی نے ڈھا کہ میں بیٹھ کر وہاں کے نواب کے حکم سے ایک مختصر سی لغت "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" مقامی شاعروں کی رہنمائی کے لئے لکھی۔ سید انشاء اللہ خاں انشاء نے ۱۸۰۸ء میں اردو صرف و نحو پر ایک "جامع اور بے مثل" کتاب لکھی کہ "اردو زبان کے قواعد محاورات اور روزمرہ کے متعلق اس سے پہلے کوئی ایسی مستند اور محققانہ کتاب نہیں لکھی گئی تھی۔" انشاکی

اس تصنیف سے اس بات کا علم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فصیح اور غیر فصیح کا معیار کیا تھا۔ ان کے خیال میں اگرچہ شاہ جہاں آباد (دہلی) کی زبان مستند اور فصیح ہے لیکن یہ بھی محلہ بہ محلہ بدلتی رہتی ہے مثلاً انشا کے بقول دہلی ہی میں مغلیہ پورہ کے رہنے والے "باتیں" کے بجائے "باتاں"، "تلواریں" کے بجائے "تلواراں"، "لگائیں" کے بجائے "لگائیاں"، "تھیں" کے بجائے "تھیاں"، "تیرے تئیں" کے بجائے "مجھ تئیں" (کہ فصیح اس کو "مجھے" بولتے ہیں)، "تیرے تئیں" کے بجائے "تجھ تئیں" (کہ فصیح اس کو "تجھے" بولتے ہیں)، ہمارے تئیں کے بجائے "ہم تئیں" (کہ فصیح اس موقع پر "ہمیں" بولتے ہیں) استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح "اس طرف" "مجھ طرف" "آپ طرف" کی بجائے "اس کی طرف" "میری طرف"، "آپ کی طرف" استعمال کرتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ لوگ "کی" کہ علامتِ اضافت ہے ہمیشہ حذف کر دیتے ہیں۔ دریا ئے لطافت میں انشاء اللہ خاں نے نہایت احترام کے ساتھ میر تقی میر کے "لہجہ اکبر آباد و شمولِ الفاظِ برج و گوالیار در وقتِ تکلم" کی شہادت دی ہے۔

غرض کہ دہلی ہی میں زبان کی نوک پلک درست ہونے کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ کم از کم فصحا ئے دہلی اس سے باخبر تھے لیکن شیخ امام بخش ناسخ (م: ۱۸۳۸ء) اور ان کے متبعین کے یہاں زبان کے غیر معیاری ہونے کا شعور تیز تر ہو گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حسب ذیل اصلاحات قابلِ توجہ ہیں۔

(۱) مضارع کے لئے (تا) اور اس کی شکلیں متحکم ہو جاتی ہیں۔ (جاتا ہے۔ کھاتا ہے۔ چلتا ہے اور جائے ہے۔ کھائے ہے۔ مارے ہے۔ متروک ہو جاتے ہیں۔ (حالانکہ غالب نے اپنی مشہور غزل اسی ترکیب سے لکھی ہے۔ ع کہینچتا ہوں جس قدر مجھ سے وہ کہینچتا جائے ہے)۔

بعض علاقوں کی بول چال کی اردو میں یہ تا حال مروج ہے

(۲) (و) زائدہ سے مرکب افعال کی مختلف شکلیں متروک ہونے لگتی ہیں۔ جیسے دیوے۔ لیوے۔ ہووے۔ ہوویگا۔ دیویں گے۔ لے لیویں گے۔

(۳) علامت (گا۔ گی۔ گے) کا مضارع کے لئے استعمال قطعاً متروک ہو گیا۔ ہے گا (= ہے) ہیں گے (= ہیں) (ہر چند بعض علاقوں کی عوامی بولی میں یہ آج بھی شمالی ہند میں سننے میں آتی ہیں)

(۴) مونث جمع اسم سے فعل کا متاثر ہونا جو میرامن، شیر علی افسوس اور اس عہد کے دوسرے مصنفین کے یہاں مستعمل رہا ہے، متروک ہو جاتا ہے: "بہتیاہیں" کے بجائے "بہتی ہیں" "گھٹائیں چھائیاں" کے بجائے "گھٹائیں چھائیں"۔

(۵) کرئیے کے بجائے "کیجئے"، ہو جے کے بجائے "ہوچیئے" اور پھر "ہوئیے"، کیجؤ کے بجائے "کریو"۔

(۶) اسمائے ضمائر میں حسب ذیل متروک ہو جاتے ہیں:

تیں (تو)، اُن نے (اس نے)، تجھ بن (بے تیرے)، جن نے (جس نے)، تجھ تیغ (تیری تیغ)، تس پر (اس پر)، تجھ (تجھ کو)، مجھ (میرے)، میں (میں نے)، تس پر (اس) ہم ہی نے (ہمیں نے)، کسو (=کسی)، وے (=وہ، جمع)، یے (=یہ، جمع)

(۷) حروف میں حسب ذیل متروک ہو گئے :

"آگو" (=آگے)، سیقی (= سے)، کھو (=کبھی)، بیچ (=میں)، اُپر (=اوپر)، لیک (=لیکن)، ندان (= ہمیشہ)، جوں (=مثل)، تد (=تب)، نت (=ہمیشہ)، پرے (=الگ)، پن (=بغیر)، تَدھر (=اُدھر)، ایدھر (=ادھر)، مت (=نہ)، نت (=ہمیشہ)، سمیت (=ساتھ)

(۸) اسماء میں مخصوص اسماء جو عرصہ دراز سے مستعمل تھے متروک قرار پائے :

دَدانہ (=دیوانہ)، جگ (=دنیا)، پُون (=ہوا)، پات (پتا)، سجن (=صنم)، کھوج (=نشان)، جاگ (=جگہ)، ماٹی (=مٹی)، دارو (=دوا، شراب)، شور شرابا (=شوروغل)، پرواہ (=پروا)، نشہ (=نشہ)، لوہو (=لہو)، پتنگ (=پتنگا، پروانہ)، جائے (=جگہ، جا)، پھتروں (=پتھروں)

دہلی میں غالب اور لکھنؤ میں میر انیس نے زبان کی اس اصلاح کا ہمیشہ تتبع نہیں کیا ہے۔ غالب نے کسو (عیاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی) ہو جئے باندھے ہیں۔ اور، جائے ہے، کی ردیف میں ایک غزل کہی ہے۔ ان کے خطوط میں، بوڑھا، گاڈی، اور، سوچ، بھی ملتے ہیں۔ اسی طرح میر انیس نے خاندانی محاورے کا پاس کرتے ہوئے، آئیاں، جائیاں، بجائیاں، باندھا ہے اور "جگہ" کے بجائے "جاگہ" لکھتے رہے۔ لیکن اصلاحِ زبان کے اثر سے بالآخر یہ دونوں بھی دامن نہ بچا سکے۔ مرزا غالب نے جا بجا لکھنؤ اور رجب علی بیگ سرور لکھنوی کی زبان دانی کا اعتراف کیا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ سرسید کے زمانے تک قواعدِ زبان کی پابندی سختی سے نہیں کی جاتی تھی۔ "الفاظ کی بے ترتیبی عام تھی، اردو فقروں پر اکثر دھوکا ہوتا تھا کہ فارسی کا ترجمہ ہیں۔ مضاف الیہ کو اکثر مضاف کے بعد لکھتے اور بولتے تھے۔ متعلقاتِ فعل کو فعل کے بعد رکھ دیتے تھے۔" فارسی محاورات کے ترجمے اب تک مستعمل تھے۔ سرسید نے "وے" (جمع وہ) کا استعمال روا رکھا اور، کر کے، کے بجائے، کر کر، آخر وقت تک لکھتے رہے۔ انہیں سے بدعت انگریزی الفاظ کے استعمال کی چلی۔ ان کے معاصرین جو انگریزی میں بس شد بد رکھتے تھے، اس کے الفاظ بے دھڑک استعمال کرنے لگے صحافت نے اس رجحان کو مزید تقویت دی۔

انیسویں صدی کے ربع آخر تک اردو قواعد کی نوک پلک کی درستی ہوتی رہی اور ایک کل ہند معیار قبولیتِ عام حاصل کرتا گیا۔ اس کام میں نذیر احمد، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی اور شرر کا بڑا ہاتھ رہا۔ یہی زمانہ سے جب امیر مینائی نے امیر اللغات کے کچھ حصص مرتب کئے اور سید احمد دہلوی کی فرہنگِ آصفیہ مکمل

ہوئی (۱۸۹۲ء) فرہنگِ آصفیہ نے اُردو زبان کے معیارات کے تعین میں بڑی مدد کی، ہر چند داغ دہلوی ا سے مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ بالآخر ۱۹۱۴ء میں مولوی عبدالحق نے اپنی مشہور اردو قواعد کا پہلا ایڈیشن شائع کر کے اس زبان کو ایک نیا قواعدی چوکھٹا عطا کیا۔

لفظیات کے نقطہ نظر سے اردو میں بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں بہت توسیع ہوئی ہے۔ ابوالکلام اور اقبال نے اس کا دامن عربی فارسی کی جانب کھینچا تو پریم چند جیسے ادیبوں نے اس کے ڈانڈے ہندی سے ملادیے۔ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ نے اصطلاحاتِ علمیہ کے ذریعہ عربی زبان کا دہانہ اس میں کھول دیا اور اسے اس لائق بنادیا کہ یہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنائی جاسکے۔ ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوا تو اردو کے سرپر آرے چل گئے۔ مثلِ دکن، وطن سے دُور ایک بار پہر اس کو اپنا گھر بسانا پڑا۔

ع آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

○○○

چوتھا باب اُردو کی ابتدا: لسانی نظریات

اُردو اور برج بھاشا

ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مرد میدان آزاد ہیں جنہوں نے سب سے پہلے آبِ حیات میں اردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزاد شمالی ہند کی بولیوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے۔ اس لیے انہوں نے اردو کا ماخذ اپنے پیش روؤں چرنچی لال وغیرہ کی طرح برج بھاشا کو بتایا۔ آبِ حیات کا پہلا جملہ یہ ہے۔

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔" - برج بھاشا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے شورشینی آپ بھرنش کی سچی جانشین ہے۔ لیکن وہ کھڑی بولی کی ماں نہیں بہن ہے۔ زبان کے معنوں میں لفظ برج (سنسکرت: درج = جانوروں کا باز یا چراگاہ) بہت بعد کو استعمال ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر دھیریندر ورما سب سے پہلے بھکاری داس نے "کاویہ نرنیئے" (سمبت ۱۸۰۳) میں استعمال کیا ہے۔

اردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا ہے، قدیم اردو کھڑی بولی اور جمنا پار کی ہریانوی بولی سے قریب تر ہے۔ جدید اردو اپنے صرف و نحو کے اعتبار سے مراد آباد اور رام پور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے۔ برج بھاشا نے بعد کو اردو معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں مدد ضروری دی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سکندر لودھی کے عہد سے لے کر شاہ جہاں کے زمانہ (۱۶۲۸ء) تک اگر ہندوستان کا پایہ تخت رہا ہے۔

(۱) اردو اور برج بھاشا (جدید دونوں میں) بعض صوتی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(الف) (اویا) والی بولیاں = برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی

(ب) (ا) والی بولیاں = کھڑی بولی اور ہریانی

برج بھاشا میں اسی لیئے اسماء، افعال اور اسمائے صفت کا اختتام عموماً (او) پر ہوتا ہے۔ مثلاً اپنو (اپنا)

چلیو (چلا) گھورو (گھوڑا) - برو (بڑا)

(۲) مغربی ہندی کی نمبر (ب) بولیاں (اے) اور (اُو) حروفِ علت کو ترجیح دی جاتی ہیں - برج بھاشا میں (اے) اور (اُو) آتے ہیں - جدید اردو کا معیاری لہجہ برج بھاشا کا تتبع کرتا ہے - مثلاً کھڑی بولی (دیہات) پیسہ - برج بھاشا اور اردو: پیسہ - اسی طرح ہے اور ہے میں (واحد متکلم) اور میں -

(۳) ہریانوی کھڑی بولی اور پنجابی میں (ڑ) اور (ڑھ) آوازوں پر (ڈ) اور (ڈھ) آوازوں کو ترجیح دی جاتی ہے - پنجابی میں (ڑھ) کی آواز معدوم ہے - قدیم اردو اور دکنی اس اعتبار سے ہریانوی کی پیروی کرتی ہیں -

آج بھی ہریانہ اور کھڑی بولی کے علاقوں میں گڈی (سہارن پور) (بڈا) (کرنال) چھاڈ (ضلع دہلی) چڈھنا (ضلع دہلی) بولے جاتے ہیں - (ڈ) اور (ڈھ) آوازوں کے متعلق یہ حکم لگانا کہ یہ پنجابی سے لی گئی ہیں، ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے ارتقا سے متعلق ناواقفیت کا ثبوت دینا ہے - (ڑ) اور (ڑھ) کی آوازیں دراصل (ڈ) اور (ڈھ) کی آوازوں کی ارتقائی شکلیں ہیں - یہ ارتقاء پراکرت میں ہوا ہے یہ آوازیں جب کسی لفظ کے اندر واقع ہوتی ہیں تو عام طور سے (ڑ) اور (ڑھ) میں تبدیل ہو جاتی ہیں - دکنی کے مذکورہ بالا الفاظ (بڈا - چڈھنا وغیرہ) میں اسی پراکرتی رجحان سے انحراف ملتا ہے جو موجودہ پنجابی، ہریانوی اور کھڑی بولی تک میں پایا جاتا ہے - لیکن لسانی ارتقا کے اصولوں کے زور پر رفتہ رفتہ (ڑ) اور (ڑھ) کی آوازیں زیادہ شستہ خیال کی جانے لگیں - اسی لیے برج بھاشا کی طرح جدید اردو اور ہندی میں (ڈ اور ڈھ) جب لفظ کے درمیان آتے ہیں تو عام طور سے (ڑ اور ڑھ) میں تبدیل ہو جاتے ہیں - مثلاً

اردو اور برج	دکنی	ہریانوی اور کھڑی بولی
بڑھانا	بڈھانا (قطب مشتری)	بڈھانا
بڑائی	بڈائی	بڈائی (نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو)
پڑھنا	پڈھنا	پڈھنا (نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو)
چڑھنا	چڈھنا	چڈھنا (نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو)
چھوڑا		چھاڈا (چوم چھاڈا بھاری پتھر محاورہ زٹلی)
		از پنجاب میں اردو ص ۱۹۸

لیکن دکنی میں پڑنا (پڑھنا) اور چڑنا (چڑھنا) (دیکھیے - فرینگ شہ پارے) بھی آیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ دکنی میں (ڑھ) کی آواز پنجابی کی طرح کالعدم نہیں بلکہ ہریانوی زبان کے مانند گاہ گاہ پائی جاتی ہے - اس کے بعد پروفیسر شیرانی کے اس قسم کی لسانی نوٹ کس قدر بے سروپا معلوم ہوتے ہیں کہ :-
"اردو کی "ڑ" ہریانوی میں "ڈ" سے بدل جاتی ہے - (پنجاب میں اردو)

جدید اردو میں (ڈ)، (ڈھ)، (ڈمشدد) اور نڈ (غنے کے ساتھ) اور (ڑ)، (ڑھ)، (ڑمشدد) اور نڑ (غنے کے ساتھ) کا استعمال حسب ذیل جدول کے مطابق پایا جاتا ہے۔

لفظ کی ابتدا	لفظ کے درمیان	لفظ کے آخر میں
صحیح	X	X
صحیح	X	X
صحیح (مشدد)	صحیح	X
نڈ (غنے کے ساتھ)	صحیح	صحیح
ڑ	صحیح	صحیح
ڑھ	صحیح	صحیح
ڑ (مشدد)	X	X
نڑ (غنے کے ساتھ)	X	صحیح

اشارے: (۱) (ڈ) صرف لفظوں کے شروع میں ملتا ہے اور (ڑ) سے کوئی لفظ شروع نہیں ہوتا۔

(۲) لفظ کے درمیان میں (ڈ) صرف "گڈریا" میں پایا جاتا ہے۔ بولیوں میں یہ بھی بدل کر "گڈریا" ہو جاتا ہے۔

(۳) لفظ کے درمیان میں (ڈ) صرف مرکب الفاظ میں ملتا ہے۔ مثلاً نڈر (ن+دڑ) سڈول، ڈانواڈول۔ ڈبڈبائی (ڈب+ڈبائی)

(۴) لفظ کے آخر میں (ڈ) ہمیشہ غنے کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً رانڈ، سانڈ، البتہ انگریزی کے مستعار الفاظ (مثلاً روڈ، بورڈ، کارڈ وغیرہ) اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے علاوہ پراکرت کے کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو درحقیقت مشدد "ڈ" رکھتے ہیں، لیکن جو اردو والے غیر مشدد طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کھڈ، اجڈ، لاڈ (جو لاڑ بھی بولا جاتا ہے)

(۵) ڈھ صرف الفاظ کے شروع میں ملتا ہے۔ درمیان میں یہ ہمیشہ ڈ کے ساتھ مشدد آتا ہے، مثلاً بڈھا (ب+ڈ+ڈھ) لفظ کے آخر میں یہ (ڑھ) بن جاتا ہے (علی گڈھ کی بہ نسبت علی گڑھ فصیح تر ہے)

(۶)۔ (ڑ) اور (ڑھ) الفاظ کے شروع میں کبھی نہیں آتے۔

(۷) مشدد (ڈ) یا (ڈھ) کا فصیح تر تلفظ (ڑ) یا (ڑھ) کی شکل میں اکثر کیا جاتا ہے۔

بڈھا	>	بوڑھا
گڈھا	>	گڑھا
ٹھڈی	>	ٹھوڑی

ان آوازوں کے لحاظ سے اردو برج بھاشا اور ہریانوی کا نہایت لطیف امتزاج پیش کرتی ہے اور اس کا یہ رجحان ابتدا سے رہا ہے ۔

اُردو اور برج کے صرفی و نحوی اختلافات

ضمائم :-

(۱) متکلم واحد بهاشامیں (میں) اور (ہوں) دونوں مستعمل ہیں - جدید ادبیات میں دونوں کا استعمال قریب قریب برابر ملتا ہے ۔۔۔۔۔۔ قدیم میں " ہوں " زیادہ مستعمل تھا اردو میں معدوم ہے - البتہ دکنی میں قلی قطب شاہ کی " ریختی " میں مل جاتا ہے

ص ۶۲ پیارے نہ کر کھیچ ، ہوں تو پہ واری

ص ۶۳ ہوں تِل تِل تمن پر تھے ہو پیاری

ص ۶۳ کہ تن من جو بن آپ ہوں تو یہ واری

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ کلیات میں "ہوں" صرف ریختی میں آیا ہے۔ اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ اس وقت تک متروک ہو چکا تھا لیکن چونکہ زنان خانے کی زبان بہت آہستہ بدلتی ہے اس لیے عورتوں کی زبان پر اس وقت تک جاری تھا۔ اس شعر میں "توپہ" (تجھ پہ) بھی قابل ذکر ہے جو خالص برج ہے۔

"ہوں" پنجابی قدیم وجدید میں بھی ملتا ہے۔ لیکن "میں" کے مقابلہ میں کم تر گجراتی میں یہ "ہوں" ہے
(۲) برج بھاشا کا "مو" اور "مو" ہیں "دکنی" کا "مجھ" اور اردو کا "مجھے" ہے لیکن قلی قطب شاہ کی
ریختوں میں مو (مبرا) اور مجھ کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ (دیکھئے ریختی ص ۶۱، ۶۲۔ کلیات)

(۳) مخاطب واحد اور جمع : برج بھاشا میں - "تو" اور "توں" کے ساتھ - "تیں" اور "تیں" بھی مستعمل ہیں جو جدید اردو میں نہیں ملتے - لیکن "عاشورنامہ" میں موجود ہیں۔ برج بھاشا کے ضمائر مخاطب کے اندر مذکور مونث کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔

"تیرا" اور "تمہارا" (جو برج بھاشا میں "تیرو" اور تمہارو " ہوجاتے ہیں) کے علاوہ ایک اور شکل " تمہارو" بھی ملتی ہے جو راجستھانی کے زیر اثر برج نے قبول کی ہے ۔ دکنی اور اردو میں یہ نہیں ملتی ۔ البتہ دہلی کی موجودہ زبان کے محاورات میں مل جاتی ہے ۔

"جیسے۔" تمہارا مال سو مہارا مال سو ہیں ہیں"

یعنی اپنے موقع پر "ہیں ہیں" کر کے ٹال جانا۔

ضمائر کی مزید شکلیں جو برج بھاشا سے مخصوص ہیں حسب ذیل ہیں - تاپیں - توہی - توہے - تیراؤں ،

تمہوں، تمہائیں - موہی، موئے، میراؤ، ہماؤں، ہمن (قدیم اردو میں ملتا ہے) ہمائیں، وہ (وہ کے لئے "وہ" دکنی میں ملتا ہے) وس - وا، واہی، وائے، وے (قدیم (اردو دکنی) میں جمع کے طور پر آیا ہے اُنی - اُن - اُنہاؤں، ونی، ون (دہل اور میرٹھ کے اطراف میں بھی ان کے لئے آتا ہے) انہائیں، ونہائیں۔

جوں، جاسو، تاسو، جنہائیں، تنہائیں - گو (کون) کاہی
(۴) برج بھاشا کے صوتی اصولوں کا ضمائر پر بھی اثر پڑا ہے مثلاً:-

اردو:	تمہیں	برج	تمہو
"	ہمارا	"	ہمارو
"	میرا	"	میرو

(۵) اسماء کی جمع بنانے کے لئے اردو میں "وں" اور پنجابی میں "اں" لگاتے ہیں - برج بھاشا میں صرف "ن" کا اضافہ کرتے ہیں -

اردو: گھوڑوں - پنجابی: گھوڑاں - دکنی: گھوڑاں
ہریانوی: گھوڑاں - برج بھاشا: گھورن
برج بھاشا کے (ن) جمع کی مثالیں البتہ دکنی کے "نوسربار" میں مل جاتی ہیں -

ع ڈھونڈن لاگے کدھر سے ٹہار (۵۶۷)

ع رُوون لاگا کس کس دھات (۱۳۱۹)

دکنی اردو کی جمع کا عام طریقہ "اں" کا ہے

افعال :

(۱) اردو میں مادہ کے اندر "تا" کا اضافہ کر کے فعل مضارع بنایا جاتا ہے - برج بھاشا میں "ت" لگایا جاتا ہے - مثلاً کرت، پرت - جات وغیرہ اس کے علاوہ مذکر کے لئے "تو" اور مونث کے لئے "اتی" کی شکلیں بھی لائی جاتی ہیں "جاتو" ہے، نہارتی (دیکھتی) ہے -

افضل کے "بارہ ماسہ" اور شیخ محبوب عالم کی ہریانی تالیفات میں مضارع کی یہ شکلیں عام طور سے ملتی ہیں - لیکن دکنی میں نہیں ملتیں -

(۲) اپنے (او) والے صوتی اصول کو برقرار رکھتے ہوئے برج بھاشا میں ماضی "مارا" یا "ماریا" نہیں ہوتا بلکہ "مارو" یا "مارو" ہوتا ہے - جیسا کہ بعض نے اشارہ کیا ہے - "ماریا" یا "مارو ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں -

(۳) مستقبل، برج بھاشا میں (گ) یا (ہ) کی مختلف شکلوں سے بنتا ہے جن میں (گو) کی بہ نسبت (ہ)

کی شکل زیادہ عام ہے۔ مثالیں۔

چلوں گی چلی ہوں

نوٹ :- عام طور سے (ہ) پوری ادا نہیں کی جاتی اس لیے چلی ہوں محض "چلیوں بن جاتا ہے۔

شیرانی کا یہ خیال صحیح نہیں کہ "گو" کی علامت مستقبل برج بھاشا نے پنجابی یا اردو سے لی ہے۔ برج بھاشا کے قدیم ترین نمونوں میں ہمیں "گو" کی شکلیں ملتی ہیں۔ ہوں چلوں گا (صفحہ ۱۶ / ۷) (دیوں گو ۲ / ۶) راکھیں گے (صفحہ ۱۴ / ۲) ہوئے گو (صفحہ ۲۴ / ۷) (ازچوراسی ویشنوں کی وارتا: گوگل ناتھ: الہ آباد (۱۹۲۶ء) (ہ) سے بنا ہوا مستقبل قدیم و جدید اردو میں کہیں نظر نہیں آتا۔

(۴) برج بھاشا کا مصدر بھی اس سے مختلف ہے۔ برج میں مصدر "بو" "وو" یا "نو" کے اضافے سے بنتا ہے۔ ہو بو۔ بوجھو۔ چلنو وغیرہ۔

(۵) افعال امدادی میں دونوں زبانوں کا اختلاف اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ زمانہ حال میں (ہ) کی مختلف شکلیں لگائی جاتی ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ صرف "ہوں" کا تلفظ برج میں "ہوں" ہو جاتا ہے۔ لیکن زمانہ ماضی میں فعل امدادی کی شکل بالکل مختلف ہے۔ اردو میں "تھا" کی مختلف شکلیں مستعمل ہیں۔ برج بھاشا میں "ہو" اور "ہتو" کی مختلف شکلیں آتی ہیں جو تاریخ اردو میں کسی عہد میں مستعمل نہیں ہوئیں۔ اسی وجہ سے برج بھاشا کے حال اور مستقبل میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔

حروف:

(۱) حروف میں کو۔ سے۔ میں اوپر دی ہوئی صوتی خصوصیات کے تحت گو۔ سے۔ میں بن جاتے ہیں۔ ہریانوی اور پنجابی میں "کو" کی بجائے "نوں" ملتا ہے۔ کھری بولی کے بعض اضلاع۔ میرٹھ، سہارنپور۔ وغیرہ میں بھی یہ سننے میں آتا ہے۔ لیکن دکنی اور برج میں "کو" ہی مختلف تلفظ (گو۔ کو، کوں) کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ برج بھاشا کے قدیم ادبی نمونوں میں، میں، سوں، نیں، پے اور مانجھ۔ پاچھیں۔ (پیچھے) سنگ، سم (طرح) بھی ملتے ہیں جو قدیم اردو میں بھی مستعمل تھے۔ لیکن بعض حروف ایسے بھی ہیں جنہیں اردو نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ مثلاً نکٹ (نزدیک) سہت (ساتھ) ہت (لیے) لوں (دکنی میں لگ ملتا ہے)۔ یہ تمام حروف برج بھاشا میں قدیم زمانے سے مستعمل تھے۔

لیکن اردو اور برج کے مذکورہ بالا اختلافات کے باوجود سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہ جہاں کی تبدیلی دارالسلطنت (۱۶۴۸ء) تک اردو کے ارتقا میں اس کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں دہلی سے آگرہ کو دارالسلطنت کے انتقال اور اس کے اثرات کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے خیال میں قدیم

اردو کی اکثر گتھیاں اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھنے سے کھل جائیں گی۔ تقریباً دو سو سال تک ہندوستان کا دارالسلطنت برج بھاشا کے علاقہ میں اگرہ رہا ہے تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے یہ دو سو سال ازمہ وسطی کی تاریخ میں اہم ترین ہیں۔ چنانچہ اردو ادبیات میں اس کی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں کہ معیار زبان کے لئے دارالسلطنت کی زبان کی طرف لوگ رجوع کرتے تھے۔ یہ کبھی برج اور کبھی "گوالیاری" کے نام سے سامنے آتی ہے۔ اس کی قدیم ترین مثال "گوالیر کے چاتران" کی زبان ہے جس کے دوہے اور کہاوتیں ملاوچی کی سب رس تک (۱۶۳۵ھ) میں مل جاتے ہیں۔ دکن کے مصنفین بھی اس کے دائرہ اثر سے باہر نہیں تھے۔ اگر شیرانی کی تحقیقات کے مطابق خالق باری ۱۶۲۱ء کو عہد جہاں گیری کے ایک بزرگ ضیاء الدین خسرو کی تصنیف مان لیا جائے تو وجہی سے قبل برج کے بارے میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"خیر خواہ شعرائے شیریں گوضیاء الدین خسرو باستدعائے
عزیز الفواد بابا اسحاق قنّاد چند الفاظ عربی و پارسی را بزبان ہندی
گوالیاری کہ ارباب روزمرہ رانا گزیر است ترجمہ نموده و در بحر
مختلف بطریق ریختہ نظم آورده -----"

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ عہد جہاں گیری میں "ہندی گوالیاری" "ارباب روزمرہ" کے لئے ناگزیر تھی۔ یہ "ہندی گوالیاری" اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور عالمگیر کے عہد تک مستند زبان سمجھی جاتی تھی۔ شاہ جہاں کا دہلی کو دوبارہ پایہ تخت بنانے سے کھڑی بولی یا زبان دہلوی کی حیات ثانیہ شروع ہو جاتی ہے۔ زبان دہلی کے نشاۃ الثانیہ میں تقریباً نصف صدی لگ گئی اور محمد شاہ کے عہد میں برج پر اس کا محاورہ اور تلفظ غالب آگیا۔ شاہ جہاں کے عہد کے ایک مصنف موسیقی ابن سید علی مرزا بیگ اپنے رسالہ "زمرئ وحدت" میں "بزبان فصیح و بلیغ گوالیار" کا ذکر کرتے ہیں۔

ع در کام خلق وصف و بیان از لب تو ہست

شیریں و خوش لساں چو زبان گوالیار

عالمگیر کے زمانے میں "زبان گوالیاری" سے "بنوالی المتخلص بہ ولی بہ امداد بھوانی داس" "گوالیاری سے فارسی میں ایک کتاب "گلزار حال" ترجمہ کرتے ہیں۔

اس سے قبل مرزا خاں کی تحفۃ الہند (۱۶۷۵ء) کا ذکر ہو چکا ہے جو شاہزادوں کی تعلیم کے سلسلے میں برج بھاشا کی پہلی قواعد فارسی میں لکھی گئی ہے۔

خان آرزو "نوادرا لفاظ" میں زبان گوالیار (یا برج) کو اکثر جگہ "افصح زبان ہائے ہند" لکھتے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں چرنجی لال اور کئی دوسرے مصنفین اردو کا ماخذ برج ہی کو بتاتے ہیں۔ چنانچہ

اسی خیال پر محمد حسین آزاد نے آپ حیات میں یہ فقرہ لکھا ہوگا۔

"اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی ہے"

ہمارا خیال ہے کہ خسرو "زبان دہلی" کے ارتقا کا شمالی ہند میں یک لخت رک جانے کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ پایہ تخت دہلی سے منتقل ہو کر آگرہ چلا گیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانہ سے (بالخصوص جب وہ اپنی فتوحات دکن کے سلسلے میں اورنگ آبادی اردو سے دوچار ہوتا ہے) زبان دہلوی کا باقاعدہ ارتقا پھر شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ ادبیات کی گوں کی سمجھی جانے لگی۔ اس وقت فارسی اور برج دونوں کا افسوس ٹوٹ چکا تھا اور دہلوی زبان پر پنجابی کے اثرات زائل ہو کر اس کی اپنی مستقل شکل متعین ہو چکی تھی۔ گو اردو کے پہلے بڑے ماہر لسانیات خاں آرزو "زبان اردو" یا "زبان اردو شاہی" کے مقابلے میں سند "گوالیاری" سے لینا پسند کرتے تھے۔ لیکن خاں آرزو آخری شاعر اور عالم تھے جنہوں نے گوالیاری کو مستند جانا ہے۔ محمد شاہ کے دور سے دہلوی سماج کے اعلیٰ طبقات کا محاورہ افصح اور بلیغ سمجھا جانے لگا۔ خاں آرزو کی گوالیاری پسندی کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے پیش نظر عبدالواسع کی غرائب اللغات ہندی تھی۔ عبدالواسع کا وطن علاقہ ہریانہ میں "ہانسی" تھا اور چونکہ ان کے پیش نظر عوامی محاورہ تھا، اس لیے انہوں نے ثقافت کے نقطہ نظر سے غلط لکھا ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ تھی کہ خاں آرزو کا آگرہ اور گوالیار سے گہرا تعلق تھا اور ظاہر ہے کہ مادری زبان کی حیثیت سے انہوں نے برج ہی کا محاورہ سیکھا ہوگا۔ لیکن چونکہ خاں آرزو نے اپنی نوادرا لالفاظ دہلی میں بیٹھ کر لکھی تھی اس لیے "الفاظ" کی بہت سی مکتوبی اور ملفوظی شکلیں وہی ہیں جو غرائب اللغات میں موجود ہیں۔ اگرچہ خاں آرزو ہانسی کے بہت سے الفاظ نکال باہر قرار دیتے ہیں مگر بہت سے ایسے الفاظ کو قبول بھی کر لیتے ہیں جنہیں بعد کے مصلحین زبان اردو نے مکروہ اور گنوارو قرار دے کر زبان سے خارج کر دیا۔

اردو اور پنجاب

پروفیسر شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں بعض مفروضات کی بناء پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کھڑی اور ہریانوی پنجابی مسلمانوں کے داخلہ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ اس کا تاریخی جائزہ پچھلے صفحات میں لیا جا چکا ہے۔ پروفیسر مرحوم کے نظریہ کا دوسرا پہلو خالص لسانیاتی ہے۔ قدیم اردو (دکنی) اور پنجابی صرف و نحو کی مشترک خصوصیات کا ذکر کر کے انہوں نے بعض اہم لسانی نتائج اخذ کیے ہیں۔ لسانی استدلال کے اس طریق پر ذیل میں تنقید کی جائے گی۔

پروفیسر شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے کہ راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کا تعلق بھی کسی زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے اثرات

کی نشاندہی آج بھی کی جاسکتی ہے۔ بعد کو (شاید شورسینی آپ بھرنش کے عہد عروج میں) اس پر اندرونی زبان، مدھیہ دیش کی زبان کا، جس کی نمائندہ بولیاں برج اور کھڑی ہیں، اس قدر گہرا اثر پڑا کہ اس کی صورت بدل گئی۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پنجابی کے درمیان خط فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ یہ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقہ پر گھل مل جاتی ہیں کہ گریسن کے خیال میں کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہندا چھائی ہوئی تھی، جسے بعد کو دو آب کی بولیوں نے پیچھے ڈھکیلنا شروع کیا اور رچنا دو آب تک ہٹا دیا۔ دو آب کی زبان کے نشانات سندھ ساگردو آب تک کی لہندا میں پائے جاتے ہیں۔ جوں جوں مشرق کی سمت آئیے اس کا رنگ اور گہرا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کو "ملواں" زبانوں کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔

ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے سلسلے میں ہر قسم کا مطالعہ اور تنقید بے سود ثابت ہوگی جب تک کہ :-

(الف) ہند آریائی زبان کے ارتقا کی عہد قدیم سے نشان دہی نہ کی جائے بالخصوص جب تک کہ عہد آپ بھرنش کی ادبیات کا لسانی جائزہ نہ لیا جائے۔

(ب) جب تک کہ تقابلی مطالعہ تمام ہمسایہ بولیوں کے ساتھ نہ کیا جائے۔ شیرانی نے اپنی تصنیف میں نمبر (الف) کو نظر انداز کر کے اپنے لسانی نظریہ کو بے بنیاد کر دیا ہے۔ نمبر (ب) کا خیال نہ رکھنی کی وجہ سے وہ بعض یکطرفہ لسانی نتائج مرتب کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ ہر دو ہمسایہ بولیوں میں کچھ نہ کچھ مشترک خصوصیات ضرور ہوتی ہیں، چنانچہ اردو اگر ایک طرف اپنی قواعد کے اعتبار سے پنجابی سے ملتی جلتی ہے تو دوسرے طرف ہریانوی سے بھی مماثلت رکھتی ہے آج کل کی معیاری اردو رام پور اور مراد آباد کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے۔ لیکن اپنے ارتقا کے ابتدائی مدارج میں یہ دو آب کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی بولی سے زیادہ قریب تھی۔ قدیم دکنی میں بعض اثرات پنجابی کے بھی جھلکتے ہیں۔ اس لئے تقابلی مطالعہ کا میدان ذرا وسیع ہونا چاہیئے اور جہاں تک ہوسکے پنجابی، اردو، ہریانوی اور برج بھاشا کی ادبیات کے قدیم ترین نمونوں پر نظر رکھنی چاہیے۔

(۱) شیرانی نے پنجابی اور اردو کی ایک اہم مشترک خصوصیت علامت مصدر "نا" بتائی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ "نا" کہ علامت مصدر پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قدیم زمانے (دیکھئے نمونہ محبوب عالم، پنجاب میں اردو) سے ہریانوی میں "ن" کے ساتھ "نا" بھی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں خود پنجابی میں "نا" کے ساتھ ساتھ "ن" بھی بطور علامت مصدر ملتا ہے۔ مثلاً "گھالنا" اور "گھالنا" (بھیجنا) جہاں تک اختتام پر نون غنہ "ناں" کا تعلق ہے یہ بھی پنجابی سے مخصوص نہیں۔ دہلی کے آس پاس کی بولیوں میں قدیم زمانے سے یہ خصوصیت ملتی ہے دہلی والے آج بھی دہلی کو دہیں (خالق باری دہیں، سب رس = دہیں) باراں،

ستراں وغیرہ بولتے ہیں۔ نون غنہ کا سلسلہ آپ بھرنش سے ملایا جاسکتا ہے۔ جس میں حروفِ علت عام طور سے انفی ہوجاتے ہیں۔ دکنی چوں کہ اکثر آپ بھرنشی خصوصیات کی حامل ہے اس لیے اس میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں مثلاً کوچہ، سنتاتا (ستانا) آدمیں (آدمی)۔ برسانت، دکھلائینگا، جائینگا ان کے علاوہ سین، کون، توں وغیرہ تو ہر صفحہ پر مل جائیں گے۔ غنہ آواز کی پیدائش جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیر خصوصیت ہے۔ توں (تو) پنجابی سے لے کر دکنی، ہریانوی، کھڑی بولی، راجستھانی اور برج بھاشا تک میں یکساں طور پر قدیم زمانے سے مستعمل ہے۔ خیر المجالس اور "مکتوبات قدسیہ" کے ہندی فقروں میں بیک وقت (تو) اور (توں) ملتا ہے۔

(۲) اردو (ا) گروہ سے تعلق رکھنے والی زبان ہے یعنی اس میں اعلام و اسماء اور اسمائے صفات الف پر ختم ہوتے ہیں۔ جب کہ برج بھاشا بندیلی اور قنوجی میں "او" پر۔ اس سلسلہ میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اردو پنجابی سے متاثر ہے جس کی نمایاں خصوصیت (ا) ہے۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ (ا) اور (او) دونوں شکلیں ازمنہ وسطیٰ کی پراکرتوں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ مغربی ہندی کی تین بولیوں نے (او) کی شکل کو اپنایا لیکن باقی ماندہ دو بولیوں (کھڑی اور ہریانی) میں (ا) ہی کی شکل ملتی ہے۔ یہ امر اب مسلمہ ہے کہ قدیم دکنی شمالی ہند کی کسی ایسی بولی پر مبنی ہے جس کی بنیاد (ا) پر ہے یعنی اس میں اسماء، اسمائے صفات اور اعلام کا اختتام "الف" پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دکنی ادبیات میں (او) کی شکل کہیں نہیں ملتی۔ اس کی مزید توضیح اردو کے ایک دیہاتی نام یعنی کھڑی بولی سے ہوجاتی ہے۔

لفظ کھڑی بولی سے متعلق اب تک عجیب و غریب قیاس آریائیاں ہوتی آئی ہیں۔

(۱) پنڈت چندر دھر شرما گلیری کا خیال تھا کہ "بدیسی مسلمانوں نے آگرہ، دلی، سہارن پور اور میرٹھ کی کسی پڑی بھاشا کو کھڑی بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے قابل بنادیا،"

(۲) کھڑی بولی کی تشریح میں اس قسم کی غلط فہمی مولوی عبدالحق کو بھی ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "کھڑی بولی" کے معنی عام طور سے ہندوستان میں گنواہری بولی کے ہیں جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ۔"

دراصل کھڑی بولی کے تصور کے لئے برج بھاشا کا پس منظر ضروری ہے ایک کا تعلق (ا) گروہ کی زبانوں سے ہے اور دوسری کا (او) گروہ والیوں سے۔ اگر یہ کہا جائے کہ برج بھاشا کے مقابلے میں یہ بولی کھڑی لگتی ہے تو بات ذرا عقلیات کے دائرہ سے نکل کر حسیات میں آجاتی ہے لیکن اس کا عقلی اور لسانی جواز ہم بیان کرچکے ہیں یہی وجہ ہے کہ بندیل کھنڈ میں ا سے "ٹھار" بولی اور مارواڑ میں ا سے "ٹھاٹھ" بولی کہتے ہیں۔ "ٹھار" اور "ٹھاٹھ" دونوں کا مفہوم "کھڑا" ہوتا ہے۔ زبان کا یہی کھڑا لہجہ پوربی اور برج بھاشا کے مقابلے میں معیاری سمجھا جاتا ہے

یہی کھڑا لہجہ ہریانے کے علاقے اور جاٹوں کی زبان میں " اکھڑ " بن جاتا ہے جو درمیانی حروفِ علت بلا استثناء دہادیتے ہیں۔ گڈی، بڈل، لٹا، رُئی وغیرہ۔ قدیم دکنی میں یہ بھی رجحان پایا جاتا ہے۔

اسماء و صفات کے سلسلے میں ذیل کی مشترک خصوصیات پر پروفیسر شیرانی نے زور دیا ہے۔

(۳) اسماء و صفات تذکیرو تانیث اور جمع واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔

اردو :- بڑا لڑکا۔ بڑے لڑکے۔ چھوٹی لڑکی۔ چھوٹی لڑکیاں۔

پنجابی :- وَڈَا مُنڈَا۔ وڈے مُنڈے۔ نکئی کڑی۔ نکئیاں کڑیاں۔

میرو سودا سے پہلے کی اردو اور دکنی میں چھوٹی لڑکیاں کی بجائے " چھوٹیاں لڑکیاں " ہی کہا جاتا ہے۔

شیرانی کے خیال میں یہ بے ضابطگی میرو سودا کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔

(۴) خبر تذکیرو تانیث، واحد، جمع میں اپنے متبدا کے موافق آتی ہے۔

جدید اردو: یہ بات بھلی نہیں یہ باتیں بھلی نہیں

پنجابی: ایہ گل چنگی نہئیں ایہ گلاں چنگیاں نہئیں

قدیم اردو دکنی: ----- باتاں بھلیاں نہیں

سودا۔ ع نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں۔

(۵) فعل تذکیرو تانیث اور واحد جمع میں اپنے فعل کے مطابق آتا ہے۔

اردو: عورت آئی عورتیں آئیں

پنجابی: بڈھی آئی بڈھیاں آئیاں

قدیم اردو (دکنی) ----- عورتاں آئیاں

حاتم لا جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں

تب سے جہاں میں تو نے دھومیں مچائیاں ہیں

سودا۔ ع۔ یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

(۶) اضافت بھی اپنے فاعل کی تذکیرو تانیث اور واحد و جمع کے مطابق آتی ہے۔

اردو: اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں بعض چاندی کی ----- وغیرہ

پنجابی: اوہ وے وچ کوٹھریاں رنگ برنگیاں بعضنیاں چاندی دیاں ----- وغیرہ

دکنی: اس میں کوٹھریاں رنگ برنگ کیاں، بعض چاندی کیاں ----- وغیرہ۔ (ہزار مسائل)

دکنی: یوں نود ہزار باتاں اللہ ہور محمد کیاں ----- (معراج العاشقین)

مذکورہ بالا لسانی خصوصیات کے متعلق یہ کہنا کہ اردو نے قدیم یا دکنی نے پنجابی سے لی ہوں گی،

محض بے بنیاد قیاس آرائی ہوگی، یہی صرفی خصوصیات دہلی کے قرب وجوار کی بولیوں میں آج پائی جاتی ہے، انبالہ کی کھڑی بولی اور ہریانہ کے علاقوں کے قدیم ترین مصنفوں محمد افضل اور عبدی، شیخ محبوب عالم، ساکن جھجھر وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں۔ مثلاً دن کی جمع دناں، کھیت کی جمع کھیتاں، گھر کی جمع گھراں وغیرہ۔ آج بھی ہریانہ کے علاقہ میں بولی جاتی ہیں۔ شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں اسی نہج پر ٹکراں - غریباں، جھوٹاں، اونٹاں وغیرہ ملتی ہیں۔

لا لب پہ کلی کے مہر کرے اس لباً کا رنگ (حاتم)

اسی طرح سے آئیاں، جائیاں وغیرہ، حاتم، میر اور سودا سے لے کر لکھنؤ میں میرانیس اور دہلی میں داغ تک نے باندھا ہے۔ راقم السطور نے خود دہلی کی بڑھیوں کی زبان سے اس قسم کے صیغے سنے ہیں۔ شاہی زمانہ تک لال قلعہ کی یہی زبان تھی۔ اس کی لسانی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ اس وقت تک جدید آریائی زبانوں میں "نے" علامت فاعلی کی شکل میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نے قدیم میں "نے" کا جتنی بے ضابطگی کے ساتھ استعمال ملتا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ قدیم اردو یا ہندی ادب میں "نے" علامت فاعلی کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے۔ افعال کا مفعول کی بجائے فاعل کے مطابق آنے کی یہی وجہ ہے۔ دکنی میں دونوں صورتوں میں بہ کثرت ملتا ہے لیکن دکنی میں "نے" کے استعمال میں بے قاعدگی ملتی ہے۔ اس میں یہ فاعل، مفعول دونوں کے لیے آتا ہے جیسا کہ ہریانوی کا دستور ہے لیکن فاعلی علامت ہونے کی حالت میں اردو کے برخلاف فعل اپنے فاعل کا تابع رہتا ہے۔

(۱) فاعلی: (۱)۔ غمزے نے نظر کو اپنے گھر لے کر گیا

(سب رس ص ۹۰)

(۲) رقیب نے، روسیہ نے، بے نصیب نے بولیا

(سب رس ص ۴۱)

(۳) مفعولی (۱) آدمی برا اچھے تو شراب نے کیا کرنا

(سب رس ص ۳۴)

(۲) بے نمک کھاتے آدمی نے کیا سواد پانا

(سب رس ص ۲۸)

میر و سودا کے زمانہ تک اس کے استعمال میں قاعدہ کی پابندی نہیں برتی جاتی تھی۔ ع۔ گل کو محبوب میں قیاس کیا (میر)۔ حاتم نے بعض اوقات "نے" فاعلی استعمال کی ہے۔ لیکن ان کا عام رجحان یہی ہے کہ وہ اسے حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کی یہ غزل جس کی ردیف، ہم، ہے (کیے ہیں ہم، پئے ہیں ہم) میں "نے" فاعلی

نہیں ملتی - مزید مثالیں "میں دیکھا" (انتخاب حاتم ص ۲) ہم سیر کو جو دیکھا "ایضاً ص ۴۱ ع - رات ہم خواب میں اس زلف کو پیچاں دیکھا - (ایضاً ص ۲) لیکن "نے" فاعلی کی مثالیں بھی مل جاتی ہیں - ع کہ جیسا ہم نے کھینچا آن کر آزار دینا میں " (ایضاً ۲۹) مزید صفحہ ۲۹ "اور صفحہ ۳۵ پر -

آج بھی ہریانوی میں بحیثیت علامت فاعل اور مفعول ایک ہی جملہ میں اس طرح استعمال ہوتا ہے -
من نے صاحب نے ماریا = مجھے صاحب نے مارا

حرفِ عطف میں "ہو" جو دکنی سے بھی مخصوص ہے پنجابی کی نمایاں خصوصیت نہیں بلکہ مغربی ہندی کی اکثر بولیوں اور راجستھانی میں مشترک ہے - مغربی روہلکھنڈ اور شمالی دوآبہ میں یہ "اور" "آر" یا "ہر" ہو جاتا ہے بلکہ دہرہ دون اور سہارن پور کے اضلاع میں یہ صاف "ہو" سنائی دیتا ہے -

افعال :

(۷) فعل امر کے متعلق شیرانی لکھتے ہیں - "امر کا قاعدہ اردو پنجابی میں بالکل ایک ہے" یعنی علامت مصدر گرا دی جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے مثلاً چلنا (چل) کرنا (کر) - پروفیسر مرحوم کا یہ بیان بالکل صحیح ہے لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی بالکل صحیح ہوگا کہ امر کا قاعدہ اردو اور بنگالی اردو 'اور گجراتی' اردو اور مراہٹی میں بالکل یکساں ہے - دراصل امر کا یہ قاعدہ پنجابی یا اردو کے ساتھ مخصوص نہیں - ہندوستان کی تمام جدید آریائی زبانوں میں امر اسی طرح بنتا ہے - چل، کرو وغیرہ آج پنجاب سے لے کر بنگال اور دکن تک بعینہ مستعمل ہیں - اس قسم کے ایک طرف بیانات عام طور سے اپنے دعویٰ کی حجت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں -

(۸) لفظ "تھا" کے متعلق پروفیسر موصوف نے ایک نئے نظریہ کا استخراج کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ملتانی زبان کے مصدر "تھیونا" (بمعنی ہونا) سے نکلا ہے - لکھتے ہیں :-

"تھا - اس غریب کولغات نگاروں نے مصدر "ہونا" کا پسر خواندہ بنادیا ہے ان کا بیان ہے کہ یہ ہونا کی ماضی ہے - - - - سنسکرت اور پراکرت کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبلوایا جا رہا ہے - لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے - کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لفظ سنسکرت کے ماخذ سے نکلا جائے - اب میں بجائے اس کے کہ "تھا" کو "ہونا" کے سر باندھوں اور پھر ہونا کو سنسکرت کے "ہو" سے استخراج کروں یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اس کو ملتانی زبان کے مصدر (تھیونا) بمعنی 'ہونا' کی ماضی مان لوں "تھیونا" کی ماضی "تھیا" آتی ہے - اردو والوں نے اسے یائے اشمام سمجھ کر

قدیم زمانے سے زور رہا ہے۔ میواتی راجستھانی ہی کی ایک بولی ہے۔

(۱۰) غیر زبان کے الفاظ کے آخر میں یا نئے زائدہ کا اضافہ بھی پنجابی کی تنہا خصوصیت نہیں۔ برج بھاشا،

قنوجی اور اودھی بولیوں میں یہ عام طور سے پائی جاتی ہے۔ کانپور کی قنوجی میں، بعد، کو "بعدی" کہا جاتا ہے۔

(۱۱) مانگا۔ تانگا۔ چپ چپاتے۔ ہلنا جلنا وغیرہ الفاظ کو شیرانی نے پنجابی صرف اس لیے بتایا ہے کہ اس

میں دوسرا لفظ جسے اور لغت نگاروں نے غلطی سے مہمل کہا ہے پنجابی میں ایک مستقل لفظ کی حیثیت رکھتا

ہے۔ اس قسم کے دوہرے اسماء گھوڑا دوڑا، لوٹا اوٹا، میں تو عام طور سے دوسرا لفظ تابع مہمل ہوتا ہے۔ لیکن

افعال میں عام طور سے ہم معنیٰ لفظ یکجا کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہندوستان کی تمام نئی آریائی زبانوں

میں ملتی ہے جس کا تعلق براہ راست پراکرت سے ملایا جاسکتا ہے۔

حالتِ مجروری میں "و" کا اضافہ بھی پنجابی سے مخصوص نہیں اردو میں آنکھوں دیکھا، بمعنی

آنکھوں سے دیکھا اب بھی مستعمل ہے۔

(۱۲) مغربی ہندی اور اس کی بولیوں کھڑی، برج اور ہریانوی وغیرہ کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ اس

میں (و) ہمیشہ (ب) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً۔

سنسکرت: وچار = پچار (برج) دکنی، ہریانوی، کھڑی)

س: وش = بس (برج)، کھڑی، ہریانوی وغیرہ)

وینا = بین (برج، کھڑی، ہریانوی، دکنی وغیرہ)

اسی طرح بیج، بات، برن، بید، وغیرہ مغربی ہندی کے علاقے میں عام طور سے بولے جاتے ہیں۔ قدیم

دکنی ادبیات سے حسب ذیل الفاظ اس رجحان کی تائید کرتے ہیں۔

جوین (س = یون = ق - ق - ۳/۲۴۰) برن (س = ورن = ف - ش - پ) بچن (س = وچن - ف - ش - پ)

بات (س = وارتاف - ش - پ) بست (س = وستو/چیز، ف - ش - پ) بس (س = وش - ف - ق - م) بجر (س وجر

پتھر) ف - ق - م) وغیرہ۔

مغربی ہندی کے اس اٹل صوتی اصول کے سامنے خود عربی فارسی کے الفاظ نہ ٹک سکے۔ چنانچہ دو آبہ کے

دیہاتوں میں "وکیل" کا "بکیل" "ولایت" کا "بلایت" وغیرہ اکثر سننے میں آتا ہے۔ اس کے برخلاف پنجابی

میں بیشتر (و) کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ مثلاً وچ (بیج) وال (بال) وڈائی (بڑائی) ویر (بیر) وچار (پچار) وگار (بگار)

وش (بس) درف (برف) وغیرہ۔

قدیم پنجابی گروگرز صاحب سے اس دعویٰ کی تائید (وچ صفحہ ۲ سطر ۱۳)۔ وڈیائی صفحہ ۳۹۵)

(وچارنا صفحہ ۱۴ پر بار بار آیا ہے)۔ وسارنا (بسرنا، صفحہ ۲۵)

پنجابی کی طرح سندھی، لہندا اور گجراتی میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

گجراتی	اردو	گجراتی	اردو
دنیا	بین	وچار	بچار
پروت	پریت	وش	بس

پروفیسر شیرانی مذکورہ بالا صوتی اصول کی تعبیر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"پنجابی اور اردو میں بعض الفاظ آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً پنجابی کی واؤ اردو میں (ب) سے تبدیل ہو جاتی ہے"

لیکن اگر پروفیسر موصوف کی نظر آریائی السنہ ہند کی تبدیلی صوت کے اصولوں پر ہوتی تو وہ شاید اردو، پنجابی کا رشتہ اس طور پر قائم نہ کرتے۔

(۱۴) پنجابی زبان کی ایک دوسری خصوصیت شیرانی یہ بتاتے ہیں کہ:-

"تمام ایسے الفاظ جن میں ثانی حرفِ علت ہو بہ تخفیف حرفِ علت تلفظ کیا جاتا ہے۔" مثلاً کان، ناک، بات، اور لات پنجابی لہجہ میں کن، نک، ہت اور لت بن جاتے ہیں یا یوں کہنا چاہیئے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشا میں پہلے حرفِ علت اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً پنجابی "پگ" برج بھاشا میں جاکر "پاگ" بن گئی۔ اردو میں جو پنجابی اور برج بھاشا کے بین ہیں ہے اس قاعدہ کا اثر بہت نمایاں ہے اور وہ دونوں کی مقلد ہے کبھی برج کی تقلید کرتی ہے، کبھی پنجابی کی اور کبھی دونوں کی۔ مثلاً اردو میں "جگنا" بھی بولتے ہیں اور "جاگنا" بھی۔ لیکن اکثر موقعوں پر دیکھا جاتا ہے کہ اردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدہ کی طرف ہے۔"

پروفیسر شیرانی کے اس خیال کے متعلق ہمیں پھر کہنا پڑتا ہے کہ وہ جدید زبانوں کے مسائل پر بحث کرتے وقت پراکرت اور آپ بھرنش کے لسانی اصولوں کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں۔ آخری دور کی پراکرتوں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ ان میں ایسے الفاظ بکثرت ملتے تھے جن میں ایک حرفِ علت سے پہلے مشدد حرفِ صحیح ہوتا تھا۔ مثلاً کھکو (کھڑگ = تلوار) مکھنم (مکھن) وغیرہ۔ چنانچہ اس قسم کے الفاظ سہل اس طرح بنائے جاتے تھے کہ مشدد حرف کو سادہ تلفظ کرتے تھے اور اس سے پہلے آنے والے حرفِ علت کو کھینچ کر ادا کرتے تھے۔ سہل بنانے کا یہ اصول شوریسینی پراکرت میں کم رائج تھا یہی وجہ ہے کہ آپ بھرنش عہد کا ادب ثقیل اور کرخت معلوم ہوتا ہے۔ برج بھاشا میں البتہ مشدد الفاظ کو آسان بنالیا جاتا ہے۔ مثلاً اردو کا، مکھن، برج بھاشا میں، ماکھن، ہو جاتا ہے۔ ع

میا میں نہیں کھائیو ماکھن روٹی - (سورداس)
 جوں جووں ہم راجستھانی، مرہٹی، گجراتی، زبانوں کے علاقے کی طرف آئیں یہ رجحان بڑھتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ گجراتی اور مرہٹی کا یہ عام اصول بن جاتا ہے۔ ان دونوں میں مکھن ہمیشہ ماکھن کہا جائے گا۔ مزید مثالیں -

اردو	مرہٹی	اردو	گجراتی
منش	مانوس	مکھن	ماکھن
اردو	برج بھاشا	پنجابی	
مانگنا	مانگنا	منگنا	
مونگ	مونگ	مُنگ	
بادل	بادل	بدل	
بیچ	بیچ	وچ	
چاول	چاول	چول	
اونچا	اونچا	اُچا	
لاکھ	لاکھ	لکھ	

دکنی میں عام طور سے الفاظ کا تلفظ بہ تخفیفِ حرفِ علت ہوتا ہے۔ مثلاً سَجَن سُرَج (سورج) انکے (آگے) تُننا (ٹوٹنا) دُب (دُوب) چند (چاند) بُند (بوند) کئی (کوئی) (جو کوئی) بدل (بادل) ہتی (ہاتھی) گنگے (گھونگے) اوپر (اوپر) بغیر (بغیر) دُسرا (دوسرا) تسرا (تیسرا) گُد (گودا) گھنگھٹ (گھونگھٹ) پر م (پریم) پرت (پریت) سُنکنا (سونگنا) منگنا (مانگنا) دُھنڈنا (دھونڈنا) آسمان (آسمان) غیب (غائب)

لیکن اکثر ایسا نہیں بھی ہوتا۔

چلی لے کے چھپ سوں پکڑت میں ہاتھ

(گلشنِ عشق صفحہ ۲۲۹: نصرتی)

اسی طریقہ سے مانگ کر (ق۔ ق صفحہ ۱۴۹ حالانکہ منگ کر زیادہ ملتا ہے۔)

بولانا۔ چھوپاتی۔ چھوپا کر (س۔ ر صفحہ ۲۳) سودتی (ف۔ ش۔ پ)

موٹی (مٹھی) بلبول (بلبل) جاگا (س۔ ر صفحہ ۱۹) چاند (س۔ ر۔ صفحہ ۳۴) راکھے (صفحہ س۔ ر۔ صفحہ ۲۱۳)

بوند (س - ر - صفحہ ۲۱۴)۔

کھڑی بولی کے اکثر اضلاع (مثلاً مشرقی ابنالہ۔ سہارن پور، میرٹھ، مظفرنگر) میں مشدد الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں اور ہریانوی کی تو یہ عام خصوصیت ہے۔

اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات ہے کہ قدیم اردو اور دکنی میں مشدد الفاظ شائستگی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ لہجہ جتنا کھڑا ہوتا تھا اتنا ہی کھڑا سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ لہجہ کسی قدر گنوار و خیال کیا جاتا ہے۔ خان آرزو، دہلوی زبان کے ارتقاء کے ابتدائی مدارج ہی میں عبدالواسع ہانوسی کے ہریانوی تلفظ پر معترض تھے اور اسے گنوار و خیال کرتے تھے۔ چنانچہ فصاحت کے اعتبار سے "جگے" پر "جاگے" "مٹھے"۔ "ہت" پر "ہاتھ"۔ "لکھ" پر "لاکھ"۔ "پچھے" پر "پیچھے" کو زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔ اہل لکھنؤ دہلی والوں کی زبان کو کسی قدر کرخت سمجھتے رہے۔ لاہور والے آج تک یوپی والوں کی زبان کو بریک (باریک) زبان کہتے ہیں۔ دہلوی اور روہلکھنڈی لہجہ میں ایک طرح صدیوں سے اردو کے تلفظ کا معیار متعین ہو گیا ہے ان کے کھڑے انداز گفتگو کے مردانہ حُسن کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔

تخفیفِ حروفِ علت کے لحاظ سے اردو برج اور پنجابی کے درمیان ڈولتی ہے۔ قدیم اردو اور دکنی میں یہ تخفیف عام طور سے پائی جاتی ہے۔ اس کا اصل سبب پنجابی نہیں بلکہ باستثناء برج بھاشا نواح دہلی کی تمام بولیوں (کھڑی بولی۔ میواتی اور ہریانوی) کی یہ عام خصوصیات ہے جس کا سلسلہ شورشینی آپ بھرنش سے ملتا ہے۔

جدید اردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی
آٹھ	آٹھ	آٹھ	دکنی
آگ	آگ۔ آگی	آگ	
آدھا	آدھا	آدھ	آدھ (سب رس)
آنکھ	آنکھ۔ آنکھی	آکھ	
آگے	آگے	آگے	انگے (سب رس)
آج	آج	آج	
اوپر	اوپر	اوپر	اُپر (شہ پارے)
ایک	ایک	اِک	بیک
بھوکا	بھوکا	بھکا۔ بکھا	
پوت	پوت	پُت۔ پتر	

پُھل	پُھل	پھول	پھول
چاند - چندر	چند	چاند - چندر	چاند
	ست	سات	سات
	کم	کام	کام
لکھ - لک (معراج العاشقین)	لکھ - لک	لاکھ	لاکھ
	لج	لاج	لاج
ہاتھ - ہت (نصرتی)	ہڈ	ہاتھ	ہاتھ
ماٹی (معراج العاشقین)	مٹی / ماٹی	ماٹی	مٹی
سینچ - سچ	سچ	سینچ	سچ
ہتی (سب رس)	ہاتھی	ہاتھی	ہاتھی
موٹھی (سب رس)	مٹھی	موٹھی	مٹھی
منگنا (سب رس)	مگدا	مانگنا	مانگنا
موں (سب رس)	موں	مُنہ	مُنہ
دکنی	پنجابی	برج بھاشا	جدید اردو
باقی (سب رس)	بتی	باقی	بتی
	مچھر	ماچھر	مچھر
پات (شہ پارے)	پتہ	پات	پتہ / پات

قدیم اردو اور پنجابی کے اختلافات

(۱) - حروف ہجا میں اردو کے ڈھ - جھ - گھ - بھ - اور دھ کا تلفظ پنجابی میں مختلف طریقہ پر ہوتا ہے۔
 ان کے علاوہ (ہ) پنجابی الفاظ کے شروع میں آتی ہے۔ درمیانی کو اہل پنجاب ایک خاص لہجہ میں بدل دیتے ہیں۔
 عام طور سے یہ ہمزہ (مخصوص Tone) کی آواز اختیار کر لیتی ہیں۔ جیسے شہر = شیئر، لاہور = لو اور یا بھوک
 = پوکھ۔ دھیان = دی ان، گھوڑا = کوڑا، سمجھ = سمج، کچھ = کچ۔

اس کے برخلاف کھڑی بولی برج بھاشا وغیرہ میں (ہ) کا تلفظ واضح طور سے ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً بارہ
 آنے، ڈھول، جھاڑ، پڑھنا، دھونا، بھائی۔ (ہ) کو (ء) میں بدل دینے کے رجحان کو نووارد ترکوں اور پڑھانوں نے مزید
 تقویت دی۔ فارسی اور ترکی میں یہ آوازیں مفقود ہیں۔

لیکن پنجابی میں افعال کے آخر میں عام طور سے لہجہ کو بلند بنانے کے لئے اس (ہ) کا بلا ضرورت بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً کریو، جانہ = جان، رہاتیں = راتیں، اس کی مثالیں قدیم زمانے سے مل جاتی ہیں۔
آدھ گرنہ ڈ صاحب: سبھ (سب) بھوکہ (بھوک) گاؤ پیں (گاویں) جاییہ (جانی ص ۱۵ پر)۔

تو دریاؤ، سبھ تجھ ہی مانہ تجھ بن دوجا کائی ناہ

یہ خصوصیت ہمیں کھڑی اور ہریانوی میں بھی ملتی ہے: افضل کے بارہ ماسہ (نمونہ پنجاب ممیں اردو) میں پیہہ (پیا) بیکہ (بھیک) پاپی (پائی) جلا ہے (جلائے) چلاہی (چلائی) چرائی (چڑھائی) باجھ (شیخ محبوب عالم کے نمونے میں بھی باجھ" ملتا ہے)۔

(۲) اردو میں ایک مزید آواز (ڑھ) ہے جو پنجابی میں نہیں ملتی یہ ایک علیحدہ اور مستقل آواز ہے جو جدید دکنی میں پائی جاتی ہے۔ قدیم دکنی میں "ڑھ" کا تلفظ "رڑ" کے مانند کیا جاتا تھا بلکہ بیشتر اس کی قدیم شکل "ڈ" یا "ڈھ" کو برقرار رکھا جاتا تھا۔ مثلاً بڈا، بڈائی۔ چڈا وغیرہ۔

ضمائر:

زبان کے کینڈے کو متعین کرنے اور دیگر زبانوں سے اس کے صحیح رشتے کو بتانے میں ضمائر کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو سب قواعد نویسوں نے تسلیم کیا ہے۔ دکنی اور پنجابی کے بنیادی اختلافات ضمائر سے اچھی طرح اجاگر ہوتے ہیں۔ میں، میرا (س۔ ر ۸/۲۵) توں (ق ۹/۲۱) تیرا (س۔ ر ۸/۲۵) واحد متکلم اور واحد مخاطب ضمائر سے قطع نظر دونوں زبانوں کے بیشتر ضمائر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔
واحد غائب۔ حالتِ فاعلی = پنجابی (ایہ) دکنی میں عام طور سے یو (س۔ ۲/۲۳۰) ملتا ہے۔ موجودہ دکنی میں "یے" اور "یہ" بھی استعمال ہوتے ہیں۔

حالتِ اضافی: واحد ہوا جمع، پنجابی کی حالت اضافی دکنی سے ہمیشہ مختلف ہوگی۔ پنجابی میں (کا، کی، کے) بجائے (دا، دی، دے) آتے ہیں۔ جس کی ایک بھی مثال باوجود کوشش کے پروفیسر شیرانی کو دکنی ادب میں نہ مل سکی۔

حالتِ مفعولی: یہی حال حالتِ مفعولی کا ہے۔ پنجابی میں یہ "نوں" کے اضافہ سے بنائی جاتی ہے۔ ہریانوی میں بھی "نوں" ملتا ہے۔ لیکن اردو ادبیات میں (دکنی ہوا یا شمالی ہند کی) اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔
ضمائر کی جمع میں دونوں زبانوں کا اختلاف اور نمایاں ہوجاتا ہے۔ یہاں دور کی بھی نسبت نہیں معلوم ہوتی۔
فاعلی جمع متکلم: پنجابی میں "اُسی" جو اردو یا دکنی میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوا۔ دکنی میں

زیادہ تر "ہمیں" آتا ہے۔ مثلاً سب رس صفحہ ۱۴۶ "ہمیں بی عجب مرد ہیں" دیگر صفحہ ۱۸۰ اور صفحہ ۲۵۹ سب رس "ہم" بہت کم ملتا ہے۔

مفعولی جمع متکلم: دکنی میں زیادہ تر "ہمنا" یا "ہمناکوں" آتا ہے جیسے سب رس ص ۱۱۸، اپنے باطن کی صورت "ہمناکوں" دکھا دو۔ س۔ رص ۳۰۰، ہمنایا دکرے گا۔

اضافی جمع متکلم: پنجابی: ساڈا۔ اساڈا = دکنی = ہمارا۔ ہمن (ق ۴/۴۰)

فاعلی جمع حاضر: پنجابی: تسیں: دکنی: تم (ق ۲/۱۶)

اضافی جمع حاضر: پنجابی: تو ہاڈا، تِساڈ: دکنی: تارا (ق ۶/۱۴) تمن (ق ۹/۱۴)

فاعلی جمع غائب: پنجابی: ایہ: دکنی: یو جو واحد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اضافی اور مفعولی حالت غائب میں پنجابی "اوہ" کی بجائے دکنی میں "وو" (ق ۳/۶۳) آتا ہے۔ قلی قطب شاہ (۲/۲۵۵) میں محض (ا) بھی ملتا ہے ان کے علاوہ اُن (ق ۴/۵۵) اور اُنے (س۔ ر ۱۰/۵۱) بھی ملتے ہیں۔

ضمائر اشارہ میں پنجابی اِنّا (اتنا) اور اُنّا (اُتنا) دکنی میں نہیں ملتے۔ اِنّا اور اُنّا آتے ہیں۔ جو شمال میں بھی رائج رہے ہیں۔ ضمائر کے نقطہ نظر سے قدیم دکنی کا نواحِ دہلی کی بولیوں (کھڑی برج اور ہریانوی) سے گہرا تعلق ہے۔

اعداد:

زبانوں کے رشتے اعداد سے بھی متعین کیے جاسکتے ہیں۔ حروف کی طرح یہ بھی کافی حد تک تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ عام طور سے ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے اعداد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ پنجابی اور دکنی کے اختلافات ذیل سے معلوم ہو جائیں گے۔

پانچ: پنجابی (جدید و قدیم دونوں) میں پنج (سنسکرت پنج) مستعمل ہے جو دکنی اور ہریانوی میں نہیں ملتا۔

تین: پنجابی میں پراکرت "تِنی" سے نکلا "تن" اور سنسکرت "تری نی" سے نکلا "ترائی" دونوں مستعمل ہیں۔ دکنی میں "ترائی" نہیں ملتا۔ پنجابی کا "یاراں" گیارہ بھی قدیم اردو میں معدوم ہے۔ بعض صوفیاء کے ملفوظات میں "گیارہ" ضرور ملتا ہے۔

بیس: پنجابی: سنسکرت ونشی سے زیادہ قریب ہے۔ دکنی کا بیس پراکرت کی بئسی سے ماخوذ ہے۔ س" کو ادا نہ کرنے کا جو رجحان پنجابی میں ملتا ہے۔ دکنی میں مفقود ہے۔ چنانچہ پنجابی میں انیس کا اُئی، اگیس کا اِکّی۔ تیس کا تیہ، اکتیس کا اکتّی، پینسٹھ کا پینٹھ اور چالیس کا چالی ملتا ہے۔ البتہ وہ اعداد جن کے لیے آخر میں حرف عِلّت آتا ہے غنہ کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں۔ موجودہ دہلی کے باشندوں کی یہ خصوصیت ہے۔ جیسے باراں، تیراں، سولان، ستران، (پنجابی ستاراں) وغیرہ۔

پچاس: پنجابی میں پنجاہ ہے۔ اس کی نسبت سے اکاون، اکونجا وغیرہ ہو جاتے ہیں۔

برج بھاشا اور قدیم و جدید اردو کے اکثر عدد مشترک ہیں۔ مثلاً ایک۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ بیس۔ لاکھ۔ (برج بھاشا دیا کرن ص ۶۲: دھریندروما)

افعال:

جہاں تک افعال کا تعلق ہے دکنی اور پنجابی میں بعض مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں اور بعض اہم اور بنیادی اختلافات بھی۔

(۱) پنجابی میں حالیہ ناتمام مادہ میں (دا) بڑھانے سے بنتا ہے۔ یہ شکل قدیم و جدید اردو میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوئی جس کی مخصوص علامت (تا) ہے جو ہریانہ اور کھڑی بولی کے اضلاع میں نمایاں طور سے ملتی ہے برج بھاشا میں یہ محض (ت) بن کر رہ جاتی ہے۔

مادہ	حالیہ ناتمام پنجابی	حالیہ ناتمام دکنی اور اردو
مر	مردا	مرتا
نکل	نکدا	نکلتا۔ نکستا
پی	پیندا	پیتا
جی	جیوندا	جیتا
کہ	کہیندا	کہتا (دکنی کتا)

اس سلسلہ میں پنجابی کی یہ خصوصیت بھی قابلِ غور ہے کہ حروفِ عِلّت پر ختم ہونے والے مادوں میں حالیہ ناتمام بنتے وقت (غنہ) کا اضافہ کر دیا جاتا ہے جو اردو اور دکنی میں معدوم ہے۔

(۲) مستقبل میں (گا۔ گی۔ گے) کے علاوہ جو اردو اور دکنی اور پنجابی میں مشترک ہیں (وا) کی علامت بھی استعمال ہوتی ہے جس کی کوئی مثال اردو کی قدیم و جدید ادبیات میں نہیں ملتی جس طرح دکنی میں برج کی علامت مستقبل (وا) بھی

(۳) افعال امدادی میں بلحاظ اور صورتوں دونوں زبانوں کا اختلاف اور بھی واضح ہوجاتا ہے۔

واحد	جمع	پنجابی	دکنی
پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
میں آں	میں ہوں	اسا آں	ہم میں
تو ایں	تو ہے	تسی او	تم ہو
اوہ اے	وہ ہے	اوہ ایں	ووہیں

خاص طور سے متکلم واحد کے صیغہ میں "آں" یا "ہاں" کی شکل کہیں نہیں ملتی۔ ماضی میں بنیادی اختلاف اور اجاگر ہوجاتا ہے۔ پنجابی میں اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ دکنی میں "تھا" یا "اتھا" کی۔

واحد	جمع	پنجابی	دکنی
پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
میں ساں	میں تھا (اتھا)	اسی ساں	ہم تھے (اتھے)
تو سائیں	تو تھا (اتھا)	تسی ساؤں	تم تھے (اتھے)
اوہ سی	وہ تھا (اتھا)	اوسن	وہ تھے (اتھے)

(۴) حالیہ ناتمام اور افعال امدادی کے مختلف ہونے کی صورت میں مرکب افعال مثلاً ماضی نا تمام (میں کرداساں) بھی لازمی طور پر مختلف ہوجاتے ہیں۔

(۵) افعال مرکب: کسی کام کے ختم کردینے کو پنجابی میں عام طور سے بیہنا (بیٹھنا) = رہنا، ہٹنا اور چکنا سے ظاہر کرتے ہیں۔

اردو اور دکنی میں رہنا، بیٹھنا اور بالخصوص ہٹنا اس طرح مستعمل نہیں۔ ان میں چکنا زیادہ فصیح اور با محاورہ ہے۔ "چکنا" پنجابی میں اردو سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ صرف شہروں میں مستعمل ہے دیہاتوں میں شاذ و نادر سننے میں آتا ہے۔ ہریانی تک کے علاقے میں "چکنا" کا مفہوم "لیا" سے ادا کیا جاتا ہے۔ ایک اور بڑا اختلاف یہ ہے کہ اردو میں سنسکرت (कृता कृत) ہمیشہ حذف ہوجاتا ہے۔ پنجابی میں یہ کبھی نہیں ہوتا۔ جیسے

س = کُرتہ	اردو = کیا	پنجابی = کیتا
س = وُتہ	اردو = ویا	پنجابی = وُتا
س = سِپتہ	اردو = سویا	پنجابی = سُتا

پنجابی میں کیتا، وُتا وغیرہ میں ت = त (ت) کا برقرار رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا تعلق لہندا سے

بہت گہرا رہا ہے۔ دکنی میں کہیں کہیں (کیتا) کی شکل نظر آجاتی ہے۔ جیسے کیتا آواز، کیتی عرض - (اردو شہ پارے: مثنوی بہرام بانو - امین ص ۲۱۲) لیکن یہ اس میں مستقل صورت نہیں اور بعد کو متروک سمجھی جانے لگی ہے۔ پھر یہ کہ وٹا، سٹا - وغیرہ کی مثالیں نہیں ملتیں۔

حروف:

پنجابی کے بعض عام مستعمل حروف دکنی میں نہیں ملتے۔
 نوں = (کو) دکنی میں کویا کوں مستعمل ہے۔ نوں - پانی پت اور کرنال کے اضلاع تک سنائی دیتا ہے۔
 وچ = اردو دکنی "بیچ" یا میں، وچ قدیم و جدید پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے (ص ۲/۱۳ آدھ گرز ڈ صاحب) گو "میں" بھی آدھ گرز ڈ صاحب میں پایا جاتا ہے۔
 : (ص ۲/۱۴ آوگرز ڈ) اردو دکنی کے ساتھ سنگ (ف - ق - م) کا مترادف ہے۔
 توڑی، تاڑی: تک کے معنوں میں آتا ہے۔ دکنی میں "لگ" ہے جو آوگرز ڈ ص ۲۵، ۲۶ میں بکثرت ملتا ہے اور لاہور سے لے کر اودھ تک کے دیہاتی رقبوں میں آج بھی سنا جاتا ہے۔
 کول، کوے: پاس کے معنوں میں پنجابی میں مستعمل ہے۔ دکنی میں مفقود ہے۔ وانگوں، وانگر: مثل کے معنوں میں آتا ہے۔ دکنی میں سنسکرت کا صم (ف - ق - م) بھی مستعمل تھا۔
 نیڑے: نزدیک دکنی (نزدیک - ق - ق - م) یا گن، گنے - (ف - ق - م) پنجابی سے مخصوص ہے۔
 سمت کے اظہار کے لیے پنجابی میں ارے، ارار، دل، سوا وغیرہ آتے ہیں جو دکنی میں نہیں ملتے۔
 بن: دکنی میں اب اتال یا بے (ف - ق - م) آیا ہے۔
 پنجابی میں مختلف اوقات کے اظہار کے لیے ویلا (بیلا) اضافہ کر دیتے ہیں۔ دھمی ویلا (علی الصباح) یہ شکل دکنی میں نہیں ملتی۔

پنجابی میں بھیتڑ، کم، اور، اندر، زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ دکنی میں، بھیتڑ کے ساتھ، بھترال، (ف - ق - م) کی شکل بھی نظر آتی ہے۔

(۷) پنجابی زبان کے بعض عام مستعمل اسماء اور افعال دکنی میں نہیں ملتے۔

اسماء: پیو (باپ) بھرا (بھائی) پُت - پتر (بیٹا) وا (ہوا) ویر (بیر) دَسْتُ (س: وسْتُ - چیز) وہٹی - رن (بیوی) دھی - کاک - کڑی (بیٹی - لڑکی) گُکڑ (مرغ) دال - کیس (بال) روکھ (دکنی، جھاڑ، نکا (چھوٹا) واج (آواز) ورودھ (دشمنی)

افعال: گھالنا (بمعنی بھیجنا جو جدید پنجابی میں مستعمل ہے) پنچانا = آدگرز ڈ ص ۲۶ / ۷ دھیانا (۱ - گ - ص ۲۶ / ۶) بھیا - بھئے (ہوا - ہوئے) ۱ - گ ص ۲۶ / ۱) وسارنا (دکنی بسرنا) ۱ - گ ص ۲۵ / ۶) دیکھنا

(دیکھنا ۱۔ گ۔ ص ۶/۷)۔

یہاں یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ صوتی اعتبار سے بمقابلہ پنجابی دکنی "ب" کی آواز کو پسند کرتی ہے۔ پنجابی میں وال (بال) وچارنا (بچارنا) وِسارنا (بسرنا) وغیرہ آتے ہیں جو مغربی ہندی کے صوتی اصولوں پر ڈھل کر دکنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔

مزید مثالیں:

پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
دس - وکھ	بس	دات	بات
واگاں	باگاں (جمع باگ)	وچارنا (بچارنا) (ف - ق - م)	
ویچنا	بیچنا	وسنا	بسنا
دار	بار	دست	بست (ف - س - ر)
وڈھائی	بڈائی (ف - س - ر)	ورت	برت (روزہ)

قدیم دکنی اور پنجابی کے مذکورہ بنیادی اختلافات کے باوجود پروفیسر شیرانی کے اس دعویٰ میں کافی حد تک صداقت ملتی ہے کہ قدیم دکنی پنجابی سے مماثل ہے۔ لیکن صوتیاتی اور صرفی و نحوی لحاظ سے دکنی کے "پنجابی پن" کی توجیہ نواح دہلی کی دوبولیوں (کھڑی، ہریانوی) سے بھی ہوسکتی ہے۔ کھڑی بولی کے ارتقا کے بارے میں خود گریسن متضاد باتیں لکھ گیا ہے۔ ایک طرف وہ پنجابی زبان کو "ملواں" زبان کی صف میں جگہ دیتا دوسری طرف کھڑی بولی کو وہ برج بھاشا کی ایک ایسی شکل مانتا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتی چلی گئی ہے۔ تیسری طرف مجموعی حیثیت سے حکم لگاتے ہوئے وہ اور چارلس لائل دونوں کھڑی بولی کو برج بھاشا سے دوسری بولیوں کی بہ نسبت قریب تر کہتے ہیں۔

یہ امر واقع ہے کہ شمالی ہند میں برج بھاشا کھڑی بولی سے بہت پہلے ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔ قدیم اردو پر پنجابی زبان کے بعض اثرات کا تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے جس نے "زبان دہلی" کے ارتقاء میں مہمیز لگائی۔ لیکن حقیقت یہ ہے، جیسا کہ ڈاکٹر چٹرجی نے اپنی تصنیف میں اشارہ کیا ہے۔ قدیم عہد میں لاہور سے لے کر الہ آباد تک کی زبان میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ مغربی یوپی اور مشرقی پنجاب کی بولیاں آج بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس زمانے میں اور قریب تھیں، جدید آریائی بولیوں کے طلوع کا زمانہ سن ۱۰۰۰ء سے پیچھے نہیں لے جایا جاسکتا۔ اس لیے قدیم دکنی کا جواز جدید پنجابی میں نہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔ بولی کی حیثیت سے اگر کسی کو قدیم دکنی سے گہری نسبت ہوسکتی ہے تو وہ دہلی کے نواح کی دو بولیاں ہیں۔ یعنی کھڑی اور ہریانوی۔ اس سلسلے میں برج بھاشا کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا۔ کیونکہ شہر دہلی ان تمام بولیوں کے نقطہ اتصال پر واقع ہے۔ ہمارا خیال

ہے کہ دکنی کے، "پنجابی پن" کی تو جیہ حسب ذیل ضلعوں کی بولیوں سے کی جاسکتی ہے۔

(۱) کھڑی کے اضلاع: سہانپور، مظفرنگر، میرٹھ اور غازی آباد۔

(۲) ہریانوی کے اضلاع: کرنال، ریتک۔

(۳) برج کا ضلع: بلند شہر، متھرا، اگرہ۔

ان میں دکنی اور قدیم اردو کے نقطہ نظر سے میرٹھ اور ریتک کے اضلاع کی بولیاں بہت اہم ہیں۔ انہیں علاقوں کے رہنے والوں پر قدیم دہلوی سماج کے وہ مختلف طبقات قائم ہوئے تھے جو کئی قسم کی ملی جلی بولیاں بولتے تھے۔ ان سب پر ترک افغانی سماج کا ٹھپہ تھا۔ ابتداء میں شہر دہلی میں خسروگی "زبان لاہوری" کا اثر بھی تھا۔

محمود شیرانی اور ڈاکٹر زور دونوں ہی اپنی تحریروں میں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ پنجاب سے کبھی بھی اتنے وسیع پیمانے پر ہجرت ہوئی ہے جس کی مثال موجودہ شہر دہلی ہے۔ آج بھی کئی لاکھ کی آبادی کے ردوبدل کے باوجود قطع نظر شہر دہلی کے آس پاس کے اضلاع کی بولیوں کا اقتدار قائم ہے۔

پروفیسر ژول بلوک نے اپنی تحریروں میں اردو کی ابتداء کے سلسلہ میں صرف ہریانوی زبان پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "ہندوستانی لسانیات" میں ہریانوی کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے اردو کی ابتدا اور ارتقاء کے سلسلے میں جس نظریہ کا خاکہ ہم نے اس کتاب میں تیار کیا ہے۔ اس میں زور نواح دہلی کی تمام بولیوں پر ہے جن کے سنگم پر شہر دہلی واقع ہے۔ دکنی کی غرابت اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ ہم معیاری اردو سے قطع نظر نواح دہلی کی بولیوں کا لسانی جائزہ نہیں لیتے۔ محمود شیرانی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پنجابی اور دکنی کی مماثلت اپنی تصنیف میں پیش کی۔ جدید تحقیق صرف اس بات کی منتظر تھی کہ دکنی کی ان خصوصیات کو جنہیں پنجابی سے منسوب کیا گیا ہے نواح دہلی کی بولیوں سے ثابت کر دے۔ کیونکہ پچھلے ابواب میں یہ بات تو مسلم ہوگئی ہے کہ ہریانوی اور کھڑی (نواح دہلی کی بولیاں) مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد کا ارتقا نہیں۔

اس تحقیقی کام کے سلسلے میں تاریخی مواد ہم صرف ہریانوی کا فراہم کر سکے ہیں کھڑی کی جدید شکلوں پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں شمالی ہند کی اردو کے قدیم ادبی نمونوں پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔



پانچواں باب

"زبانِ دہلی و پیرامنش" (خسرو)

اردو کی ابتدا پر تحقیقی کام کرنے کے لیے قدیم ترین موادِ دکنی اُردو کے نمونوں میں دستیاب ہے۔ دکن میں یہ زبان شمالی ہند سے پہونچتی ہے۔ اردو کے محققین نے دکن میں اس زبان کی اشاعت کا سلسلہ علاء الدین خلجی کی فتوحاتِ دکن ۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء سے قائم کیا ہے۔ زبانِ دہلی کی دوسری بڑی لہر ۱۳۲۴ء میں سلطان محمد بن تغلق کے ساتھ پہونچتی ہے۔ جس نے دولت آباد کو دارالسلطنت قرار دیا۔ ہر چند شمال اور دکن کے تہذیبی و سیاسی روابط اس سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

روایات کے دُھندلکے سے نکل کر تاریخ کی روشنی میں آئیے تو چالوکیہ اور یادو خاندانوں کے عہدِ حکومت میں دکن اور شمالی ہند کے گہرے تعلقات ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اب تک لسانی اثرات کے شواہد بہت کم مل سکے ہیں۔ "دکن کا پدیہ اور گدیہ" کے مصنف نے جو نہ پا اور آپ بھرنش کے مصنفین کی تحریروں سے دکنی زبان کا آغاز کیا ہے وہ بقول چٹرجی صحیح نہیں۔ اس لیے لسانی نقطہ نظر سے دکنی زبان کے قدیم ترین نمونے وہ قرار دیئے جائیں گے جو اُردو رسم الخط میں لکھے ہوئے سلطنتِ بہمنیہ کے قیام کے بعد سے دکن میں دستیاب ہیں۔

"زبانِ دہلی" ترکوں اور افغانوں کی قیادت میں جمنا پار کے جاٹ اور گوجر دکن لے جاتے ہیں۔ شہرِ دہلی تین بولیوں کے سنگم پر واقع ہے۔ جمنا پار مغرب میں ہریانوی رائج ہے۔ شمال مشرق میں کھڑی اور جنوب میں برج کا علاقہ ہے۔ اردو کے ارتقا میں ان تمام بولیوں کے اثرات مختلف زمانوں میں پڑتے رہے ہیں۔ دکن کی زبان کا محاورہ سلاطینِ دہلی کے عہد کی یادگار ہے جب کہ اگرہ کی برج کے اثرات ہنوز نہیں پڑے تھے۔ دہلی میں بولیوں کی آنکھ مچولی کی داستان تفصیل سے بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اس عہد کا تحریری مواد تقریباً مفقود ہے۔ البتہ صوفیہ کے اقوال اور ملفوظات میں جو جابجا "زبانِ ہندی" یا ہندوی کے بکھرے ہوئے فقرے ملتے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہے کہ جاٹوں اور گوجروں کی زبان کا محاورہ اس زمانہ میں غالب تھا۔ یہی لسانی سطح دکن میں پہونچتی ہے۔ چونکہ ہریانوی اور پنجابی میں بہت سے عناصر مشترک ہیں۔ اس بنا پر پروفیسر شیرانی دکن کے لسانی مواد کا مقابلہ پنجابی سے کر کے سلسلہ اس سے ملادیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خسرو کی زبانِ دہلی میں ایک سے زیادہ بولیوں کا محاورہ لسانی ارتقا کی جولان گاہ میں آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ دکن میں بھی ایک سے زیادہ بولیاں پہونچی ہیں اس لیے اردو کی ابتدا کے سلسلے میں نئے نظریے کی تشکیل اس طور پر کی جاسکتی ہے کہ ہم اپنے پہلے زبان شناس امیر خسرو کی زبان "دہلی و پیرامنش" سے اشارہ لے کر نواحِ دہلی کی بولیوں کا تقابلی مطالعہ کریں

اور دکنی زبان کی خصوصیت کو پنجابی کے بجائے ان میں پہچاننے کی کوشش کریں۔ ایسا کرتے وقت ان بولیوں کے جدید رُوپ ہی پیشِ نظریہ رہیں بلکہ ان قدیم نمونوں کا بھی جائزہ لیں جو دستیاب ہیں۔ مذکورہ بالا تقابلی مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے کہ قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست دوآبہ کی کھڑی اور جمنا پار کی ہریانوی کے زیرِ اثر ہوئی ہے۔ اور جب سولہویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول زبان ہو جاتی ہے تو سلاطینِ دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعہ درست ہوتی ہے۔ اُردو اور برج کے عنوان کے تحت اس کی تفصیل دی جا چکی ہے۔ فی الحال ہریانوی اور کھڑی سے بحث کی جائیگی۔

اُردو اور ہریانوی

قدیم دکنی زبان کے مطالعہ کے سلسلے میں اب تک ہریانوی کو بالکل نظر انداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہی زبان ہے جو قطع نظر شہرِ دہلی، ضلع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے۔ پروفیسر شیرانی ا سے قدیم اردو کی ایک شکل گردانتے ہیں۔ اُردو نے قدیم سے متعلق لسانی تحقیق کے سلسلے میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے اس کی طرف سب سے پہلے اشارہ پروفیسر ژول بلوک نے اپنے ایک مضمون "ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل" میں کیا ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں کہ پنجاب پہلا صوبہ ہے جو مسلمانوں کے زیرِ اقتدار آیا اور عرصہ تک رہا۔ اسی لیے پنجابی اور اُردو کی مماثلت یاد رکھئے۔ لیکن یہ اس قیاس کے مانع نہیں کہ ہندی لشکروں کے جو لوگ پہلے پہل اپنی زبان کو دکن لے گئے پنجاب سے متعلق تھے، بلکہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبہ سے تعلق رکھتے تھے۔ مغربی روہیلکھنڈ کے متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ ان اضلاع کی اُردو نما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے۔"

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں :-

"لہذا میرے خیال میں مشرقی پنجاب کے اضلاع کی زبان لشکریوں کے ذریعہ دکن تک پہنچتی ہے جس نے مردِ ایام سے شستہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔"

(ص ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ B.S.O.S ۱۹۲۸ء۔ ۱۹۳۰ء)

بعد کو ژول بلوک کی تحریروں ہی سے متاثر ہو کر ہریانوی کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر زور آہنی کتاب "ہندوستانی لسانیات" میں یوں رقم طراز ہیں :

یہاں ایک اور بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابل لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زبانِ دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف میں اُس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اسی علاقہ کے رہنے والے بہیرو بنگاہ کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آکر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتح و مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آرہی تھی اس میں ہریانی عنصر بھی شامل ہو گیا۔"

(صفحہ ۹۰ لسانیات ۱۹۳۲ء حیدر آباد دکن)

ژول بلوک کے مذکورہ بالا اشارات سے لسانیاتی تحقیق کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ لیکن ہریانوی سے متعلق لسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں بعض دشواریاں حائل تھیں۔

(۱) قدیم ادبی نمونوں کا فقدان۔

(۲) ہریانوی زبان کی کسی قواعد کا دستیاب نہ ہونا۔

پہلی کمی کو پروفیسر شیرانی کے ان مضامین نے کسی حد تک پورا کر دیا ہے جو اورینٹل کالج میگزین کے نومبر ۱۹۳۶ء اور فروری ۱۹۳۲ء کی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے ہریانوی کے کئی قدیم مصنفوں کے ادبی نمونے آجاتے ہیں جن میں شیخ عبداللہ انصاری، شیخ محبوب عالم ساکن جھجھر، اکرم رہتکی المختلص بہ قطبی، شاہ عبدالحکیم، شاہ غلام جیلانی رہتکی قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا مصنفوں کے علاوہ لسانی نقطہ نظر سے سب سے زیادہ قابل تصانیف عہدِ عالمگیری کے مشہور فارسی داں میر عبدالواسع ہانسوی کی صمد باری اور فرہنگ غرائب اللغات ہیں۔ صمد باری، خالق باری کے طرز پر لکھی ہوئی، تین زبانوں کی فرہنگ ہے غرائب اللغات کا اصل نسخہ مفقود ہے۔ البتہ سراج الدین علی خاں آرزو کے تصحیح شدہ نسخے تصحیح "غرائب اللغات ہندی" کے نام سے متعدد کتب خانوں میں ملتے ہیں۔ خان آرزو، عبدالواسع کی زبان کو معیاری نہیں مانتے ہانسوی چوں کہ ہریانہ کے علاقے میں ہے اس لیے ہندی الفاظ کی فصاحت کا معیار عبدالواسع یہیں کی بولی سے متعین کرتے ہیں۔ خان آرزو زبانِ وطن مصنف ہریانی کو فصیح نہ مان کر برج گوالیری کو "افصح السنہ ہند" قرار دیتے ہیں۔

دوسری یعنی قواعد کی کمی کو کسی حد تک ان لسانی نوٹوں سے پورا کیا گیا جو راقم السطور نے دہلی کے اطراف و مضافات سے مختلف ذرائع سے حاصل کیے ہیں۔ گریسن کے عظیم المثل لسانیاتی جائزہ ہند میں بھی اس غریب بولی کے متعلق تفصیل سے نہیں لکھا گیا ہے۔ نہ تو اس کی قواعد کا دیگر بولیوں کی طرح خاکہ دیا گیا ہے

اور نہ ہی فرہنگ میں اس کے الفاظ کو جگہ دی گئی ہے۔ ہریانوی زبان کی جائو زبان کے نام سے ایک مختصر سے فرہنگ جنرل ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی جس کے مصنف مسٹری جوزف آئی۔ سی۔ ایس تھے گریسن نے اپنے "لسانی جائزہ ہند" میں اس سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔

اس سلسلے میں حال کی دو اہم تصانیف کا ذکر ضروری ہے جو مقدمہ تاریخ زبان اردو کی پچھلی اشاعتوں کے وقت دستیاب نہیں تھیں۔ پہلی ڈاکٹر جگدیوسنگھ کی "بانگروں کی توضیحی قواعد" (انگریزی ۱۹۴۰ء) اور دوسری ڈاکٹر رام بلاس شرما کی "بھارت کے پراچین جہاشا پریوار اور ہندی" (ہندی: ۱۹۴۹ء) جس میں ہریانوی کی لسانی اہمیت اور اس کے تاریخی کردار پر نہایت عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۹۸۵ء میں ہریانہ ساہتیہ اکادمی نے "ہریانوی-ہندی کوش" شائع کیا ہے۔

(۱) ہریانوی اور قدیم دکنی میں بعض صوتی مماثلتیں پائی جاتی ہیں ہریانوی میں اردو کی "ڑ" کی جگہ "ڈ" کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے۔

ملاً وجہی نے سب رس اور قطب مشتری میں (دیکھئے فرہنگ) چھوڑ کو چھوڈ، پڑھے کو پڈھے، بڑا کو بڈا، چڑھنا کو چڈھنا لکھا ہے جو بعینہ ہمیں ہریانی کے قدیم مصنف شیخ عبدی کے فقہ ہندی (۱۰۴۴ھ) میں ملتے ہیں۔ (ڑ) پر (ڈ) کو ترجیح عبدالواسع نے بھی دی ہے۔ مثلاً "اساڑھ" کی بجائے "اساڈھ"۔ بڑہس کی بجائے "بڈہس" بڑھنا کی بجائے "بڈھنا" بھیڑ کی بجائے "بھیڈ" پیڑو کی بجائے "پیڈو" جو آج بھی ہریانوی اور کھڑی کے ملحقہ علاقوں میں مستعمل ہے۔

شیخ عبدی کے فقہ ہندی میں ہمیں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جس میں ہریانوی زبان کے عام اصول کے مطابق حرف کی حرکت سے متاثر ہو کر حرفِ علت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

مثلاً: بُرائی = بورائی	رکھے = راکھے
سچ = ساچ	سکھانا = سکھاونا
تئیں = تائیں	ہڈی = ہاڈ
لہو = لوہو	

غرائب اللغات

باندھ - بجائے بند	باندھ - بجائے بند
تھانولا - بجائے تھالا	ساتو - بجائے ستو
پھونکنی - بجائے پھکنی	تاپ - بجائے تپ

ان میں اکثر الفاظ قدیم دکنی ادبیات میں اسی تلفظ کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ راکھے تائیں۔ ہاڈا اور لوہو کے لئے دیکھئے فرینگ سب رس۔ مزید مثالیں شہ پارے جلد اول کے فرینگ سے مل جاتی ہیں۔ بلانا = بولانا، چھپاتی = چھوپاتی۔

شیخ محبوب عالم ساکن جھجھر دوسرے ہریانی مصنف کے محشر نامہ میں لاگا (لگا) ماٹی (مٹی) راکھوں (رکھوں) چالیں (چلیں) ہاڈ (ہڈی) وغیرہ مل جاتے ہیں۔

دکنی میں غنہ کے کثرت استعمال کی توجیہ بھی پنجابی سے نہیں ہریانوی سے کی جاسکتی ہے۔ جیسے دکنی ادبیات کے سین (سے) کون (کو) توں (تو) یا علامت مصدر نا کو، ناں، بولنا (چلنا، کھانا، جاناں) یا کونچے، کونچے۔ س، ر، ص ۹/۴۹۔

سنتانا (ستانا ف، ق۔ م) آدمیں (آدمی) ف۔ ق۔ م) برسانت (برسات ف۔ ق۔ م) وغیرہ براہ راست ہریانوی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں ذیل کے الفاظ غنہ کے ساتھ درج ہیں۔ پہلیں (پہلے) ناچیں۔ بنچانی (بچائی) مانس (ماس) سین، کون، تو وغیرہ۔

دہلی کے قدیم باشندوں کی گفتگو میں یہ الفاظ آج بھی سنائی دیتے ہیں۔ خالق باری میں، وہی، کے بجائے، وہیں، ملتا ہے۔ ملا وجہی سب رس میں "وہیں" ہی لکھتے ہیں۔ لیکن حضرت امیر خسرو نے اپنے ایک شعر میں "وہی" قافیہ کیا ہے

گجری کہ تو در حسن و لطافت چومہی

ہر گاہ بگوئی کہ "دہی لیہودی"

ہریانوی اور قدیم دکنی دونوں میں، جھ، بھ، چھ، دھ، وغیرہ کا تلفظ سہل اور سادہ ہو جاتا ہے جیسے بھی (بی) مجھ (مج) گُچ (کچھ) (دیکھئے سب رس اور ہریانی زبان کے نمونے گریسن۔ لسانی جائزہ ہند جلد نہم حصہ اول)

(۲) دکنی میں اور ہریانوی میں جمع بنانے کا طریقہ بھی مشترک ہے۔ دونوں میں اردو کے معیاری قاعدے "وں" کے اضافے کے برعکس "آں" لگا کر بناتے ہیں۔ اس کی توجیہ پنجابی سے کی گئی ہے لیکن ہریانوی سے بھی ہوسکتی ہے۔ شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں جمع اس طور ملتی ہے۔

نکراں غریباں جھوٹاں اوٹناں

لیکن چونکہ اورنگ زیب کے عہد میں اردو جمع بنانے کا قاعدہ متعین ہو چکا تھا اس لئے "کان" کی جمع "کانوں" اور "گمان" کی جگہ "گمانوں" مل جاتی ہے۔ جدید ہریانوی میں: گھوڑاں۔ دناں۔ کھیتاں وغیرہ۔

(۳) دکنی میں ماضی قریب و فعل حال میں، سے، سوں، سین، اور، ساں، مطلق نہیں ملتے جو

پنجابی زبان سے مخصوص ہیں۔ موجودہ ہریانوی میں بھی یہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن قدیم ہریانوی کے مصنفوں کے یہاں نہیں ملتے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہریانہ علاقہ میں یہ بعد کو پنجابی اثرات کے تحت رواج پا گئے ہوں گے۔
(دیکھیے محشر نامہ محبوب عالم)

(۴) اُردو کی معیاری فعلیہ شکل کھاکر، جاکر، آکر کی بجائے شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں یا ئے زائدہ کے ساتھ آئے کر، کھلائے کر، اُٹھائے کر، اوچائے کر، پروئے کر اور لائے کر ملتے ہیں۔ وجہی کی ایک غزل دیکھیے۔

پیوں اپنے کون ٹک آج میں سپنے دیکھے سوئے کر
میں روئے کر، ہوئے کر، کوئے کر، کھوئے کر قافیہ کے طور آئے ہیں۔

(۵) افعال امدادی میں ہریانہ کے "سوں" "سین" اور "ہوں" ہیں۔ زمانہ حال میں دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ دکنی میں پہلی شکل نہیں ملتی۔ جدید ہریانوی میں یہ پنجابی کے اثر سے آئی ہے۔
(۶) موجودہ اُردو کا فعل احتمالیہ ہریانوی میں اپنے اصل مفہوم یعنی محض حال کے معنوں میں مستعمل ہے جس کی گردان حسب ذیل ہوگی۔

جمع

واحد

متکلم: ماروں۔ ماراں (میں مارتا ہوں) مارائیں۔ ماریں۔ ماراں

مارو

حاضر: مارائی۔ مارے

مارئیں۔ ماریں

غائب: مارائی۔ مارے

جو دکنی سے قریبی مماثلت رکھتی ہیں۔

(۷) اُردو میں ایسے مصادر کے ماضی مطلق جن میں علامت مصدر سے قبل (ا) یا (و) نہیں ہوتا۔ اس طرح بنتی ہے کہ امر کے آگے (ا) بڑھادیتے ہیں۔ لیکن دکنی میں بجائے (ا) کے "یا" لگادیتے ہیں۔ مثلاً ماریا، رہیا، چلیا، کہیا، کھلیا، لگیا، قدیم و جدید ہریانوی میں یہ بعینہ اسی طرح ملتے ہیں۔ صرف رہتک کی زبان میں کہیہ کا کہا، لگیا کا لگا اور چلیا کا چلا ہوتا جاتا ہے۔ جو یقیناً کھڑی بولی کے اثر سے ہے۔

(۸) دکنی کے ضمائر بھی پنجابی کی بہ نسبت ہریانوی سے زیادہ قریب ہیں۔ جن ضمائر کی توجیہ شیرانی پنجابی سے کسی طرح نہیں کر سکے وہ ہریانوی میں جوں کے توں ملتے ہیں۔ متکلم جمع ہریانوی میں ہم اور ہمیں آتا ہے۔ دکنی میں بھی ہم اور ہمیں۔ (ف۔ س۔ ر) مستعمل ہے۔ پنجابی میں اس کے برعکس 'اسی' ملتا ہے جو دکنی میں کبھی استعمال نہیں ہوا۔ حاضر جمع۔ پنجابی تسی ہے: ہریانوی تم (کھڑی بولی کے علاقے میں بھی اس کا یہی تلفظ ہے) اور تمہیں ہے۔ دونوں دکنی میں ملتے ہیں۔ (تم کا تلفظ تم ہو جاتا ہے)۔

دیگر ضمائر بھی دونوں زبانوں کے یکساں ہیں۔
 ضمائر اشارہ: اردو: یہ دکنی: یو۔ ہریانی: یو۔ یوہ۔
 اردو = اس۔ دکنی۔ اس۔ ہریانی: اس "پنجابی ایس ہے۔"
 اسی طرح جو۔ جس۔ کون اور کسی بھی مشترک ہیں۔
 قدیم ہریانی میں (شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں) حسب ذیل ضمائر ملتے ہیں۔ وہ، یہ، اے، وے،
 اس، ان، یو، تس، تیں، توں، توہ، تجھ، تم، تیرا، تیرے، تیری، میں، مجھ، میرا، میری، ہم، ہمارا۔
 جو دکنی اور ہریانوی میں مشترک ہیں۔
 ضمائر میں تصرف دکنی کے طرز پر ہے۔ مثلاً ہم سے ہموں، ہمیں۔ تم سے تموں، تمہیں۔ اُن سے اُنہاں،
 انہوں (دکنی انوں)۔

(۹) ہریانی زبان کے عام مستعمل حروف جو اس کی قدیم تالیفات سے اکٹھے کئے جاسکے ہیں حسب ذیل

ہیں۔

شیخ عبداللہ انصاری: مانہ، میں، سوں، نانہ (نہیں)، آگہ (آگے)، پچھوں (پچھے)۔
 شیخ محبوب عالم: کو، بہت، میں، ماں، ماہیں، بیچ، بیچ، سین، کوں، پپر، موں، میں، ماں، مانجھ،
 (درمیان) اندر۔ علاوہ ازیں تے، تھے اور سیتی عام مستعمل حروف ہیں جو دکنی اور ہریانی دونوں میں مشترک ہیں
 کھڑی، ہریانوی اور دکنی ایسی زبانیں ہیں جن میں قدیم زمانے سے حروف "نے" علامتِ فاعلی اور
 مفعول دونوں طرح سے مستعمل ہوتا چلا آیا ہے۔ اردو میں "نے" صرف فاعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اور
 وہ بھی افعال متعدی میں چونکہ یہ سنسکرت کے مفعول "لگیا" سے نکلا ہے (لگے، لے، نے) اس لئے بیشتر زبانوں
 میں یہ علامت مفعول ٹھہرایا گیا ہے لیکن اردو میں چونکہ "کو" علامتِ مفعول موجود ہے اس لئے یہ فاعل کے
 ساتھ مخصوص ہو گیا۔

جدید ہریانی: من نے صاحب نے ماریا (مجھے صاحب نے مارا) (فاعل، مفعول ایک ساتھ)

قدیم دکنی: فاعل: اس خاطر زلیخا نے کیا کری۔ (سب رس۔ ص ۵۶)

مفعول: آدمی بُرا اچھے تو شراب نے کیا کرنا۔ (سب رس۔ ص ۳۱)

اردو اور کھڑی بولی

لائل اور گریسن ان دونوں نے اردو/ہندی کی بنیاد کھڑی بولی (ورناکھر ہندوستانی) کو تسلیم کیا ہے۔ ان
 کے بعد اردو ہندی کے بیشتر محققین تفصیلات پر غور کیے بغیر اس منتر کا جاپ کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں
 دو باتیں قابلِ توجہ ہیں۔ پہلی یہ کہ کوئی بھی تربیت یافتہ زبان کسی بھی عوامی بولی سے مکمل طور پر لسانی

مماثلت نہیں رکھتی۔ یہی صورتِ حال اردو اور کھڑی بولی کے باہمی رشتے کی ہے۔ دوسری یہ کہ کھڑی بولی کے ایک سے زیادہ رُوپ ہیں۔ کم از کم اس کی دوشکوں کی نشان دہی گریسن نے بھی کی ہے اور فرانسیسی عالم ژول بلوک نے بھی۔ اس کا ایک رُوپ وہ ہے جو دواہ گنگ و جمن کے بالائی حصے یعنی سہارنپور، مظفرنگر اور میرٹھ (بشمول نوترا شیدہ ضلع غازی آباد) میں رائج ہے۔ اور دوسرا وہ جو گنگا پار کے بجنور، رام پورا اور مراد آباد کے اضلاع میں بولا جاتا ہے۔ کھڑی بولی کی پہلی شکل یعنی بالائی دواہ کی بولی کو مشہور ہندی محقق اور نقاد ڈاکٹر رام بلاس شرما ہریانوی ہی کا ایک رُوپ مان کر اسے "گروجن پد کی بانگرو بھاشا" کہتے ہیں۔ ہندی کے بعض مصنفین اسے "کوروی" کا نام دیتے ہیں۔ پروفیسر ژول بلوک نے بھی ان لوگوں کے وطن کی نشان دہی جو شمال سے پہلے پہل اپنی زبان دکن لے گئے تھے "ضلع انبالہ اور شمالی دواہ" کے اضلاع کی ہے، اس تصریح کے ساتھ:

"مغربی روہیل کھنڈ کے متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ ان اضلاع کی

اردو نما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے۔"

مغربی روہیل کھنڈ سے مراد بجنور، مراد آباد اور رام پور کے اضلاع ہیں جہاں کی کھڑی، معیاری اردو سے قریب ترین ہے۔

جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اس کا کھڑی نام بہت زیادہ پُرانا نہیں۔ پریم ساگر کے مصنف للو لال جی کو ی نے ۱۸۰۳ء میں برج بھاشا سے امتیاز کرنے کے لئے اسے استعمال کیا تھا۔ گریسن نے "لسانیاتی جائزہ ہند" (جلد نہم حصہ اول) میں اسی بولی کو "ورنا کلر ہندوستانی" کے نام سے یاد کیا ہے جس کی دواہی شکلیں ہیں: اردو اور ہندی۔

کھڑی بولی کے ادبی نمونے اردو کی شکل میں اور اردو رسم خط میں سب سے پہلے دکن میں ملتے ہیں۔ فخر دین نظامی بیدری کی تصنیف "مثنوی قدم راؤ پدم راؤ" (۱۴۲۱ء اور ۱۴۳۵ء کے درمیان) اس کا پہلا مستند نقش ہے۔ ان نمونوں کی زبان پر تفصیلی محاکمہ ہم تیسرے باب میں کر چکے ہیں۔

ہندی ادبیات میں للو لال جی کی پریم ساگر سے قبل اس کا کوئی مربوط اور مسلسل نمونہ نہیں ملتا، گو اس کی بعض قواعدی خصوصیات کی نشاندہی آپ بھرنشی ادبیات تک میں کی گئی ہے۔ ہندی ادب میں نامدیو (۱۳۱۸ تا ۱۴۰۸ء کبیر داس (۱۴۴۰ تا ۱۵۱۵ء) اور گرونانک (۱۴۶۹ تا ۱۵۳۹ء) کی بائیوں میں اس کی پٹ مل جاتی ہے اور بس۔

شمالی ہند میں بجز حضرت امیر خسرو کی غیر مستند ہندی شاعری، صوفیہ، کرام کے ملفوظات میں جا بجا بکھرے ہوئے ہندی کے فقرے اور فارسی فرہنگوں میں ہندی نژاد الفاظ کے سوا محمد افضل افضل (۱۶۲۵ء) کی بکٹ کہانی (بارہ ماسہ) تک کوئی مسلسل اور وافر نمونہ نظم و نثر کا نہیں ملتا۔ افضل کی بکٹ کہانی برج بھاشا کی

پٹ لئے ہوئے اس عہد کی اردو کی نمائندگی کرتی ہے جس میں ریختہ کا اسلوب بھی جابجا جھلک اٹھتا ہے۔
لسانی نقطہ نظر سے سترھویں صدی کے اواخر (۱۶۸۸ء) کی سب سے اہم تصنیف روشن کا "عاشورہ نامہ" ہے۔

یہ عاشورہ نامہ بہ ہندی زبان

کہوں کربلا کی لڑائی عیاں

مصنف کے قول کے مطابق یہ "بعضے مردماں" کے اصرار پر یہ "جنگ نامہ بہ ہندی زبان" عوامی ضرورت کے لئے کہا گیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ "عاشور نامہ ادبی لحاظ سے جس قدر ساقط الاعتبار ہے لسانی لحاظ سے اسی قدر اہم دستاویز ہے۔" ایک لحاظ سے عاشور نامہ کی زبان دکنی اردو اور اٹھارویں صدی کی دواہ کی زبان کی ایک کڑی ہے اور بہت سی مشترک لسانی خصوصیات کی حامل ہے۔ کم از کم کھڑی بولی کی یہ سب سے قدیم اور اہم لسانی اور تاریخی دستاویز ہے جس کے مواد سے ہم "اردو اور کھڑی" کے باہمی رشتے کو اجاگر کرنے میں مدد ملی ہے۔

اٹھارویں صدی کے نصف اول کی "زبانِ دہلی" کے سب سے مستند نمونے ہمیں میر جعفر زٹلی (م): ۱۷۱۲ء کی کلیات، شاہ مبارک آبرو کے دیوان (۱۷۲۶/۲۷ء)، کلیات نواب صدر الدین فائز (۱۷۳۰/۳۱ء) اور شاہ حاتم کے قدیم دیوان (۱۷۳۱/۳۲ء) میں ملتے ہیں۔ انہیں کے ساتھ ناجی، یک رنگ اور مضمون وغیرہ کا کلام رکھنا ہوگا ہر چند ان کے دوا دین سنین تصنیف کا صحیح علم ابھی تک نہیں ہوسکا ہے۔

صوتی خصوصیات

کھڑی بولی کی صوتیات کئی لحاظ سے معیاری اردو کی صوتیات سے مختلف ہے۔

- (۱) اس لحاظ سے اس کی سب سے بڑی خصوصیت معکوسی ن (RT) کا کثرت سے استعمال ہے جو اردو نے اپنے ارتقا کی کسی منزل میں قبول نہیں کی اس اعتبار سے اردو برج کا تتبع کرتی ہے۔
- (۲) دوسری خصوصیت کثرت سے مشدد الفاظ کا استعمال ہے۔ اسی لئے بالائی دو آہے کے ضلعوں کو بعض اوقات "اضلاع مشددہ" کہا جاتا ہے۔ ان اضلاع میں رٹی (روٹی)، بدل (بادل)، چدر (چادر)، گڈی (گاری) وغیرہ عام ہے۔ روشن علی نے عاشور نامے (۱۶۸۸ء) میں کُل، حُر، جگہ بلا تکلف باندھے ہیں۔ معیاری اردو اس لحاظ سے بین بین ڈولتی ہے۔ ایک طرف اس میں مکھن، مچھر، چکی ملتے ہیں تو دوسری طرف روٹی، بادل اور چادر پائے جاتے ہیں۔ قدیم اردو یعنی دکنی اس لحاظ سے کھڑے بولی سے قریب ہے جس میں سنا (سونا)، چلا (چولا) وغیرہ عام ہیں۔

(۳) دکنی اردو کی طرح کھڑی بولی کی یہ عام خصوصیت ہے کہ اس میں درمیانی (ہ) گرا دی جاتی ہے اور نفسی آوازیں اپنی ہائیت کھودیتی ہیں۔ عاشور نامہ میں نئیں (نہیں) وو (وہ۔ دو کے ساتھ قافیہ ہے) کاں (کہاں) ہر چند بعض اوقات 'کہاں' بھی ملتا ہے۔

ع کہاں سیتی آئے گا کاں ہوئے گا (شعر ۱۹۳۸)

(۴) کھڑی میں قدیم اردو کی طرح مصوتوں کا انفیا نے رجحان عام ہے۔ عاشورہ نامہ: فاطماں (فاطمہ) 'کہناں (کہنا) دیاں (دیا) 'کوئچ در کوئچ (کوچ در کوچ) ' (۵) ساکن کو متحرک کر دینے کا بھی رجحان ہے جو عوامی اردو کی تاحل خصوصیت ہے۔
عاشور نامہ: شَکْل، رَحْم، نَظْم، اَصْل (قافیہ دل)
طُفْل، مِصْر، عَقْل، ذِکْر، شِناخت وغیرہ۔

(۶) معیاری اردو کے برعکس کھڑی / ژ / اور / ژھ / پر / ڈ / اور / ڈھ / کو ترجیح دیتی ہے جو دکنی اردو کی بھی خصوصیت ہے۔

اسماء

(۱) دکنی اردو میں جمع کی عام علامت (ان) ہے۔ ہر چند نو سربار جیسے مخطوطات میں (ون) اور (ن) کی جمعیں بھی مل جاتی ہیں۔ (ان) کی جمع آج بھی میرٹھ، مظفرنگر اور سہارن پور کے اضلاع میں سنائی دیتی ہے جیسے دنان، کہیتاں وغیرہ۔ لیکن عاشور نامے کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ سترھویں صدی کے اواخر تک (ون) کی جمع رائج ہو چکی تھی۔ روشن علی نے (ان) کی جمع کا استعمال صرف عربی فارسی الفاظ کے لئے کیا اور وہ بھی ہمیشہ نہیں۔ اس کے برعکس ولی کے ریختوں کے زیر اثر متقدمین شعرائے دہلی (ان) کی جمع کا بھی استعمال تحریر میں کرتے رہے۔

ع دو بھواں تیغ جنوبی سی دراز (فائز)

ع ناگنی سی تھیں لٹاں دواس کے بر (فائز)

ع لب پہ گلوں کے مہر کرے ان لبان کا رنگ (حاتم)

جمع کا یہ قاعدہ جدید و قدیم ہریانوی کی عام خصوصیت ہے۔

(۲) 'نے' کا استعمال دکنی اردو کی طرح کھڑی میں بھی بے قاعدہ طور پایا جاتا ہے یعنی یہ فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں آتا ہے۔ مثلاً بندر نے اس نے دیکھ لیا (بندر نے اس کو دیکھ لیا)۔ فاعلی حالت میں 'نے' کو محذوف کر دینے کا عمل دکنی اردو کی طرح فائز، آبرو، حاتم بلکہ سودا اور میر تک کے یہاں ملتا ہے۔

ع ایک دیکھی میں بہنگیڑن دل ربا (فائز)

ع گل کو محبوب میں قیاس کیا (میر)

، نے ، کے باقاعدہ استعمال کی مثالیں نہ صرف متقدمین شعرائے اردو کے یہاں بکثرت ہیں ، روشن علی کے یہاں بھی ملتی ہیں

ع بہت سے دلا سا خلیفہ نے کی

اسمائے ضمیر

(۱) دکنی اردو کا "یو" (ق-ق) بعینہ آج بھی کھڑی کے علاقہ میں رائج ہے۔

(۲) دکنی اردو کا او (وہ) کھڑی میں اوہ کی شکل میں رائج ہے۔

(۳) دکنی میں عام طور سے اضافی حالت میں "میرا" اور تیرا "کی بجائے "مُج" (ولی اص ۱) مُنج

(ق-ق ص ۴) اور ، تج ، (ق-ق ص ۳) استعمال ہوتا ہے۔ قدماء کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں مل جاتی ہیں جس سے ثابت ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں۔ مثلاً حاتم کے یہاں "تم ساتھ" (انتخاب ص ۱۸) تجھ گلبدن کی بُو (انتخاب ص ۲۳) تجھ عشق (دیوان زادہ ص ۳۵۹) مجھ ساتھ ، مجھ پاس (فائز ص ۱۴۸) ہمن پاس (فائز ایضاً) موجودہ اردو اور دہلی کی بولیوں میں یہ اب متروک ہے۔

(۴) جمع متکلم اور حاضر کی مفعولی حالت میں "ہمنا" اور "ہمن کو" اور "تُمننا" "تُمن کو" کی شکلیں ملتی ہیں۔ حاتم کے یہاں اس کی مثال نہیں ملتی۔ نواح دہلی کی بولیوں میں صرف برج بھاشا میں یہ شکلیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کا کوروی (۱۵۶۳ء) نے ضمائر کی یہ شکلیں اپنے ایک شعر میں استعمال کی ہیں۔

ہمنا تمن کو دل دیا ، تم دل لیا اور دکھ دیا

ہم یہ کیا ، تم وہ کیا ، ایسی بھلی پیت ہے

(۵) ہمن "ہمیں" اور ، ہمیں کو ، کی دکنی شکلیں بھی قدیم اردو میں رائج تھیں۔ مثلاً پنڈت چندر بھان

برہمن ۱۶۶۲ء کے اس مصرع میں

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے

افضل کا بھی ایک مصرع ہے .. ع

سنی دل سوں کبھی دیکھی ہمن کوں

(۶) دکنی کے ضمائر میں سب سے قابل ذکر "اپس" ہے جو قلی قطب شاہ (ص ۴) سے لے کر ولی

(کلیات ص ۲) یکساں طور پر خود کے معنوں میں مستعمل پایا جاتا ہے۔ اس کا تعلق بھی نواحِ دہلی کی بولی سے ہے۔ افضل کے بارہ ماسہ کا یہ شعر دیکھئے ۔

اری سبزک پیا کے باغ جاکر آپس کوں بے وفا سیتی لوکا کر

افعال:

دکنی اردو کے بیشتر افعال کی توجیہ ہریانوی کے قواعد سے کی جا چکی ہے۔ ہریانوی سے پنجابی اور راجستھانی افعال کی کچھ مخصوص شکلوں کو نکال دینے کے بعد اس میں اور کھڑی کے افعال میں بالکل فرق نہیں رہتا۔ ادبی اردو میں افعال کی بیشتر شکلیں (مثلاً جائے ہے، کھائے ہے، ماروں ہو، آوے، لاوے۔ کیجیو۔ دیجیو۔ ہووے گا (انتخاب حاتم ص ۲۱) بناؤنا (بمعنی بنانا قلمی نسخہ دیوان زادہ ص ۲۳۷) لے لیویں۔ دیویں، راکھو (فائز ص ۲۰۷) لیو، دیوؤ، ہیگا (عاشورنامہ) ع فرشتہ تھا ایک پروں پر سوار (شعر ۱۳۷) جو آج فصاحت کے مرتبہ سے گر گئی ہیں، نواحِ دہلی اور دہلی میں بلا تکلف استعمال کی جاتی ہیں۔ دکنی ادبیات میں یہ ہر صفحہ پر مل جائیں گی۔ کہلاوے (س۔ ر۔ ص ۲۲) جیوے گا (س۔ ر۔ ص ۳۷) سپاوے (س۔ ر۔ ص ۳۷) اتھا اور اتھی کی شکلیں عاشورنامے میں شاذ مل جاتی ہیں۔ قدماء کے یہاں نہیں ملتیں۔

حروف:

دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواحِ دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں۔ دکنی کے عام مستعمل حروف ربط حسب ذیل ہیں:

کا۔ کی۔ کے۔ کوں (ق۔ ق۔ ص ۲۳۲) سیتی (ق۔ ق۔ ص ۲۳۵) سیتے (ق۔ ق۔ ص ۸۷) تے (ق۔ ق۔ ص ۸۷) (س۔ ر۔ ص ۱۸) سوں (ق۔ ق۔ ص ۲۳۶) تھے (ق۔ ق۔ ص ۲۳۲) ستیں (ق۔ ق۔ ص ۲۳۴) (ق۔ ق۔ ص ۲۳۶) میں (و۔ لی۔ ص ۲) منے (ق۔ ق۔ ص ۲۲۵) میں (ق۔ ق۔ ص ۲۳۲) لگوں (ق۔ ق۔ ص ۵۱) لگ (و۔ لی۔ ص ۱۸) لگن (س۔ ر۔ ص ۱) میں (کلیات و۔ لی۔ ص ۵) پ (ق۔ ق۔ ص ۲۳۶) پو (س۔ ر۔ ص ۱۵) تئیں۔
ان میں سے کوں۔ سوں۔ سی۔ منے۔ لگ۔ اور یہ دکنی میں عام مستعمل تھے اور قلی قطب، وجہی اور ولی سب کے یہاں ملتے ہیں۔ "تھے" قلی قطب سے مخصوص ہے۔ لگن اور پو وجہی سے۔ شمالی ہند میں "سیتی" اور "ستی" روشن عالی، فائز، ابرو، حاتم اور دیگر متقدمین کے یہاں بار بار آیا ہے۔

روشن علی	ع	جورو ہاتھ سیتی جو اس کے گئی
فائز	ع	ادھر اس کے یاقوت سیتی ہیں بیش
"	ع	عقیق یمن لب ستی منفعل

آبرو ع شعر کو مضمون ستی جو قدر ہی ہے آبرو
 ع حکمت کی تیغ سیتی کاٹور قیب کا سر
 حاتم دل میں طمع نہیں مجھے شاہ و گداستے
 میں سب کو چھوڑ ساز کیا ہوں خداستے

" لگ " سب قدماء کے یہاں پایا جاتا ہے ۔ کون ۔ سین میں انفی آواز آج تک نواح دہلی کی بولیوں کی خصوصیت ہے ۔ قدیم اردو میں کون (ص ۸۸ پنجاب میں اردو) افضل ، فائز ، آبرو سب کے یہاں ملتا ہے وہ " سے " کو " سین " اور " نے " کو " نیں " بھی لکھتے ہیں ۔ پ ۔ کا ۔ کی ۔ کے ۔ نے اور تئیں اردو کے عام مستعمل حرف ربط ہیں ۔ دکن کے دیگر عام مستعمل حروف حسب ذیل ہیں ۔

سو ۔ جو ۔ تو ۔ ہو ۔ و ۔ چ (ہی کے معنوں میں تاکید کے لئے) ان میں " چ " تاکید کو چھڑ کر (جیسے آپیچ ، یونہیچ ، نہیچ بمعنی آپ ہی ، یوں ہی ، نہیں ہی ۔ باقی تمام حروف نواح دہلی میں قدیم زمانے میں انہیں معنوں میں رائج تھے ۔ " ہو " " ہو " " آر " اور " ہر " کی شکل میں سہارن پور ، میرٹھ اور ضلع دہلی میں آج بھی سنائی دیتا ہے ۔

" چ " تاکید الیبتہ مرہٹی زبان سے لی گئی ہے اس کی مثال شمالی ہند کی بولیوں میں نہیں ملتی ۔ یہ مرہٹی سے مخصوص ہے ۔ یہ سنسکرت کے " چ ، ایوا " سے ماخوذ ہے ۔ ا سے میں دکنی مخطوطات کا ، نکو ، کے ساتھ کلیدی لفظ سمجھتا ہوں ۔

قدیم دکنی کے اکثر غریب الفاظ کی توجیہ نواح دہلی کی بولیوں سے کی جاسکتی ہے ۔

(۱) دھریا دھیر (فرہنگ قطب مشتری) بمعنی سمت اور طرف کے استعمال ہوا ہے ۔ میرٹھ کی نواح کی بولی میں دھورے اب تک سمت کے معنوں میں مستعمل ہوتا ہے ۔ (دیکھئے میرٹھ کی زبان کا نمونہ : گریسن ، جلد نہم)
 (۲) کدھیں (ف ۔ ق ۔ م) کبھی کے معنوں میں اب تک دہلی اور اس کے اطراف میں مستعمل ہے ۔ قدماء کے یہاں مسلسل ملتا ہے ۔

(۳) اتاول (ف ۔ ق ۔ م) قدیم دکنی میں " جلد " کے معنوں میں آتا ہے ۔ دہلی کا محاورہ ہے قدماء کے یہاں انہیں معنوں میں ملتا ۔ اتاولا باؤلا (جلد باز پاگل ہوتا ہے)

(۴) آپ (ف ۔ ق ۔ م) آپ ہی کے معنوں میں پانی پت اور کرنال میں سنائی دیتا ہے ۔

(۵) اتّا ۔ جتا (ف ۔ ق ۔ م) جہلا میں عام مستعمل ہے ۔

(۶) فکروند (ف ۔ ق ۔ م) فکر مند : ہریانی میں عام طور سے " م " (و) میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ جیسے دہلی

میں چلمن کو چلون عام طور سے کہتے ہیں ۔

(۷) وستاد - وصول (فد ق م) بمعنی استاد اور اصول قدیم دکنی میں ملتے ہیں۔ دہلی اور میرٹھ کی بولی میں یہ عام ہے جہاں استاد کو، وستاد، اور، ان، کو، ون، بولا جاتا ہے۔

(۸) اچھنا (سب رس) بمعنی ہونا عام طور سے دکنی میں ملتا ہے۔ دہلی کے مضافات کی جو قدیم بولی دکن سے لی جائی گئی ہے اس میں فعل "اچھنا ہے اور" اپنے کے ساتھ ساتھ مستعمل تھا "اچھنا" قدیم و جدید راجستھانی اور گجراتی میں ملتا ہے اور یہ آپ بھرنش کا عام مستعمل لفظ تھا جو اکثر بولیوں میں اب متروک ہو گیا ہے۔

(۹) دیسنا: بمعنی دکھائی دینا، دکنی کا عام مستعمل فعل ہے۔ شمالی ہند کی قدیم اردو میں بھی یہ بہ کثرت ملتا ہے۔

(۱۰) اُچجنا: بمعنی اگنا۔ پیدا ہونا۔ خالص سنسکرت کا لفظ ہے جو دکنی میں ملتا ہے لیکن اردو میں عرصہ سے متروک ہے۔ دہلی کا ایک محاورہ ہے بویا گیہوں اُچجا جو (بھلائی کے بدلے بُرائی) (۱۱) پتیا نا: یقین کرنے کے معنوں میں قدیم دکنی میں ملتا ہے لیکن اردو میں اب متروک ہے۔ لیکن دہلی کے دو محاورے سُنئے۔ (۱) اندھا جب پتیا ئے (یقین کر لے) جب دو آنکھیں پائے۔ (۲) بامن جیمے ہی پتیا ئیں (جب مطلب ہو جائے تو یقین کرنا)

(۱۲) سیونا: بمعنی پرورش کرنا۔ خدمت کرنا۔ دکنی میں مستعمل ہے۔ دہلی کا محاورہ ہے۔

انڈے سیوے فاختہ کوئے میوئے کھائیں

(۱۳) گھالنا: قدیم دکنی کا عام مستعمل فعل ہے۔ اس کی شکل دہلی کے ایک محاورہ میں دیکھئے۔ ایک گھر گھالو اپنا دوسرے آس پڑوس (دوسروں کو ساتھ لے ڈوبنے کے معنوں میں)

(۱۴) رُچ: خوشی کے معنوں میں سب رس اور قطب مشتری میں اکثر ملتا ہے۔ دہلی کا ایک محاورہ ہے۔

ایک گھر بچے تو سب گھر رُچے (خاندان کے ایک کا خوش ہونا سب کا خوش حال ہونا ہے)۔

(۱۵) ناؤں اور ٹھاؤں: (نام اور جگہ) قدیم دکنی اور اردو میں عام مستعمل تھے۔ دہلی کے دو محاوروں

میں یہ جوں کے توں ملتے ہیں۔

۱۔ پھٹے میں پاؤں، دفتر میں ناؤں (دخل در معقولات دینا)

۲۔ ثابت قدم کو ہر جگہ ٹھاؤں۔

(۱۶) فارسی افعال پر اردو کا ٹھپہ لگادینے کا رُجھان دکنی میں عام ہے۔ مثلاً خرچ سے خرچنا۔ شمالی ہند

میں یہ اب کم بولا جاتا ہے۔ دہلی کا پُرانا محاورہ ہے۔

جو گدھا جیتیں سنگرام تو کاہے کو خر چے دام

(ادنیٰ سے نکلے کام تو اعلیٰ کو کون پوچھے)

(۱۷) کہوانا۔ کاڑنا (نکالنا) آج بھی دہلی اور اس کے مضافات میں رائج ہے۔

ہمارے خیال میں مراہٹی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی اردو کے تمام غریب الفاظ کی توجیہ نواح دہلی کی تین بولیوں (ہریانی، کھڑی اور برج) سے کی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ شمالی ہند میں زبان کے ارتقا کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں لسانی ارتقا بالکل رُک سا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی اردو میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے چھ سو برس پہلے رائج تھیں ماحول یا جواب صرف گھریلو اور دیہاتی زبان میں پائی جاتی ہیں۔ جدید آریائی زبانوں کی تحقیق کے سلسلے میں محققین کی ایک عام غلطی یہ بھی رہی ہے کہ انہوں نے بعض بولیوں کو بعض علاقوں سے مخصوص کر دیا ہے۔ اس قسم کے لسانی مغالطوں کا پول ہم شروع سے کھولتے آئے ہیں۔ جیسا کہ نئی تحقیق سے اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مہاراشٹری پراکرت کا مہاراشٹر دیس سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ شور سینی کی ایک ترقی یافتہ شکل تھی۔ دراصل ہندوستان میں زبانیں قبیلوں، سماج کے مختلف طبقات اور پیشہ وروں کی جماعتوں سے مخصوص رہی ہیں۔ ہر زمانہ میں دہلوی سماج کے مختلف طبقات میں مختلف بولیاں رائج رہی ہیں۔ ہمارا پہلا ماہر لسانیات اور لغت نگار خان آرزو جب "نوادِرِ الالفاظ" میں اہل اردو کا معیار متعین کرتا ہے تو اُسے حسب ذیل زبانوں کے گورکھ دھندے پر نظر رکھنی پڑتی ہے ہندی کتاب (سنسکرت) گوالیاری (برج) ہندی راجپوتی (راجستھانی) (ہندی کشمیری)، ہندی پنجاب (پنجابی) زبان مردم پنجاب، زبان اردو، زبان اکبر آباد (اگرہ) و شاہجہاں آباد (دلی) اصطلاح شاہجہاں آباد و اہل اردو، ہندی فصحاء۔

تاریخی تحقیق سے جوں جوں مختلف علاقوں کی آبادیوں کی نقل و حرکت پر روشنی پڑے گی لسانی گتھیاں خود بخود حل ہوتی چلی جائیں گی۔ جس طرح دو آبہ کے مختلف راجپوت گھرانوں میں راجستھانی گیت رائج ہیں۔ ممکن ہے کہ دکن میں بھی شمالی ہند کی ایک بولی نہ گئی بلکہ کئی بولیاں پہنچی ہوں جن کی آمیزش سے بعد کو محمد قلی قطب شاہ، وجہی اور عبدل کی معیاری دکنی متشکل ہوتی ہے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ تمام بولیاں "دہلی و پیرامنش" (خسروآبی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے اردو کی ابتدا پر مزید کام کرنے کے لئے نواح دہلی ہی کی بولیوں کی جدید و قدیم شکلوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے، جن سے عام طور پر دکن کے محققین ناواقف ہیں۔ اس راہ میں یہ سنگِ گراں حائل ہے کہ دہلی کے نواح کی دو بولیوں ہریانی، کھڑی کے قدیم نمونے ناپید ہیں اور شاید اسی بناء پر محمود شیرانی اور ان کے تتبع میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور کھڑی بولی اور ہریانی کو فتح دہلی کے بعد کا ارتقا مانتے ہیں، اور اس طرح چندر شرما گلیری کے اس قیاس کی تائید کرتے ہیں کہ "بدیسی مسلمانوں نے اگرہ،

دہلی، سہارنپور، میرٹھ کی پڑی بولی کو کھڑی بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے مطابق بنالیا۔ لیکن یہ قیاس ہند آریائی زبان کے اس تحقیقی مواد کا بطلان کرتا ہے جو شورسینی پراکرت اور آپ بھرنش کے بارے میں جمع ہو چکا ہے اور جس کی رُو سے پنجابی کے ارتقاء پر مدھیہ دیش کی زبان کی گہری چھاپ ہے۔ پروفیسر شیرانی کی نظر اس لسانی مواد پر نہیں رہی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور بھی اس مواد سے بے خبر تھے۔

اردو کی ابتدا کے سلسلے میں تحقیق کی جو سمت اس تصنیف میں مقرر کی گئی ہے تمام تر نئے مواد سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ نواحِ دہلی کی بولیوں کے قدیم نمونے جوں جوں روشنی میں آتے جائیں گے یہ بات بھی واضح ہوتی جائے گی کہ اردو کا ماخذ یہی بولیاں ہیں۔ دکن میں یہ بولیاں "زبانِ دہلی" کی ایک ایسی شکل میں پہنچتی ہیں جب وہ سیال تھی اور اس پر مختلف لسانی اثرات کار فرما تھے۔ شمالی ہند میں اردو ارتقا کا عمل متقدمین شعرا نے دہلی بلکہ دبستانِ لکھنؤ تک جاری رہا۔ جب کہ دکن میں قلی قطب شاہ اور وجہی کی ادبی زبانوں میں اس کا رُوپ متعین ہو جاتا ہے۔

اس لیے زبانِ دہلی و پیرامنش "اردو
کا اصل منبع اور سرچشمہ ہے اور
"حضرتِ دلی" اُس کا حقیقی مولد و
منشاء۔

